سلسلۂ نصابات تعلیم جامعۂ عثمانیہ

تاریخ ہند

کتاب اوّل

(برائے انٹرمیڈیٹ)

مؤلفہ
مولوی سیّد ہاشمی صاحب فرید آبادی
رکن سررشتہ تالیف و ترجمہ
جامعہ عثمانیہ

سنہ ۱۳۳۸ھ م سنہ ۱۳۲۹ف م سنہ ۱۹۲۰ء

مطبوعہ دار الطبع سرکار عالی حیدرآباد دکن

مقدمہ



دنیا میں ہر قوم کی زندگی میں ایک ایسا زمانہ آتا ہے جب کہ اُس کے قوائے ذہنی میں انحطاط کے آثار نمودار ہونے لگتے ہیں، ایجاد و اختراع اور غور و فکر کا مادّہ تقریباً مفقود ہو جاتا ہے، تخیل کی پرواز اور نظر کی جولانی تنگ اور محدود ہو جاتی ہے، علم کا دار و مدار چند رسمی باتوں اور تقلید پر رہ جاتا ہے۔ اُس وقت قوم یا تو بیکار اور مردہ ہو جاتی ہے یا سنبھلنے کے لئے یہ لازم ہوتا ہے کہ وہ دوسری ترقی یافتہ اقوام کا اثر قبول کرے۔ تاریخ عالم کے ہر دَور میں اس کی شہادتیں موجود ہیں۔ خود ہمارے دیکھتے دیکھتے **جاپان** پر یہی گذری اور یہی حالت اب **ہندوستان** کی ہے۔

جس طرح کوئی شخص دوسرے بنی نوع انسان سے قطعِ تعلق کرکے تنہا اور الگ تھلگ نہیں رہ سکتا اور اگر رہے تو پنپ

نہیں سکتا اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ کوئی قوم دیگر اقوام عالم سے بے نیاز ہو کر پھولے پھلے اور ترقی پائے۔ جس طرح ہوا کے جھونکے اور ادنیٰ پرندوں اور کیڑے مکوڑوں کے اثر سے وہ مقامات تک ہرے بھرے رہتے ہیں جہاں انسان کی دسترس نہیں اسی طرح انسانوں اور قوموں کے اثر بھی ایک دوسرے تک اڑ کر پہنچتے ہیں۔ جس طرح **یونان** کا اثر روم اور دیگر اقوام **یورپ** پر پڑا جس طرح **عرب** نے **عجم** کو اور **عجم** نے **عرب** کو اپنا فیض پہنچایا، جس طرح اسلام نے **یورپ** میں تاریکی اور جہالت کو مٹا کر علم کی روشنی پہنچائی اسی طرح آج ہم بھی بہت سی باتوں میں مغرب کے محتاج ہیں۔ یہ قانون عالم ہے جو یوں ہی جاری رہا اور جاری رہیگا۔

"دئے سے دیا یوں ہی جلتا رہا ہے"

جب کسی قوم کی نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے اور وہ آگے قدم بڑھانے کی سعی کرتی ہے تو ادبیات کے میدان میں پہلی منزل **ترجمہ** ہوتی ہے۔ اس لئے کہ جب قوم میں جدت اور اپج نہیں رہی تو ظاہر ہے کہ اس کی تصانیف معمولی، ادھوری، کم مایہ اور ادنیٰ ہونگی۔ اُس وقت قوم کی بڑی خدمت یہی ہے کہ ترجمہ کے ذریعہ سے دنیا کی اعلیٰ درجہ کی تصانیف اپنی زبان میں لائی جائیں۔ یہی ترجمے خیالات میں تغیر اور معلومات میں اضافہ کریں گے، جمود کو توڑیں گے اور قوم میں ایک نئی حرکت پیدا کریں گے اور پھر آخر یہی ترجمے تصنیف و تالیف

کے جدید اسلوب اور ڈھنگ سمجھائیں گے۔ ایسے وقت میں ترجمہ تصنیف سے زیادہ قابل قدر، زیادہ مفید اور زیادہ فیض رساں ہوتا ہے۔

اسی اصول کی بنا پر جب عثمانیہ یونیورسٹی کی تجویز پیش ہوئی تو ہز اکزالٹڈ ہائینس رستم دوراں ارسطوئے زماں سپہ سالار آصف جاہ مظفر الممالک نظام الملک نظام الدولہ نواب میر عثمان علیخان بہادر فتح جنگ جی۔سی۔اس۔آئی۔جی۔سی۔بی۔ای۔والی حیدرآباد دکن خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ نے جن کی علمی قدر دانی اور علمی سرپرستی اس زمانہ میں احیائے علوم کے حق میں آب حیات کا کام کر رہی ہے، بہ تقاضائے مصلحت و دوربینی سب سے اول سررشتۂ تالیف و ترجمہ کے قیام کی منظوری عطا فرمائی، جو نہ صرف یونیورسٹی کے لئے نصاب تعلیم کی کتابیں تیار کریگا بلکہ ملک میں نشر و اشاعت علوم و فنون کا کام بھی انجام دیگا۔ اگرچہ اس سے قبل بھی یہ کام ہندوستان کے مختلف مقامات میں تھوڑا تھوڑا انجام پایا مثلاً فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں زیر نگرانی ڈاکٹر گلکرسٹ، دہلی سوسائٹی میں، انجمن پنجاب میں زیر نگرانی ڈاکٹر لائٹنر و کرنل ہالرائڈ، علی گڑھ سائنٹفک انسٹیوٹ میں جس کی بنا سر سیّد احمد خاں مرحوم نے ڈالی۔ مگر یہ کوششیں سب وقتی اور عارضی تھیں۔ نہ اُنکے پاس کافی سرمایہ اور سامان تھا نہ اُنہیں یہ موقع حاصل تھا

اور نہ انہیں اعلیحضرت و اقدس جیسے علم پرور فرمانروا کی سرپرستی کا شرف حاصل تھا۔ یہ پہلا وقت ہے کہ اردو زبان کو علوم و فنون سے مالا مال کرنے کے لئے باقاعدہ اور مستقل کوشش کی گئی ہے۔ اور یہ پہلا وقت ہے کہ اردو زبان کو یہ رتبہ ملا ہے کہ وہ اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ قرار پائی ہے۔ احیائے علوم کے لئے جو کام آگسٹس نے رومہ میں، خلافت عباسیہ میں ہارون الرّشید و مامون الرّشید نے ہسپانیہ میں عبدالرحمٰن ثالث نے، بکرماجیت و اکبر نے ہندوستان میں، الفرڈ نے انگلستان میں، پیٹر اعظم و کیتھرائن نے روس میں اور مُت شی ہٹو نے جاپان میں کیا، وہی فرمانروائے دولت آصفیہ نے اس ملک کے لئے کیا۔ اعلیحضرت واقدس کا یہ کارنامہ ہندوستان کی علمی تاریخ میں ہمیشہ فخر و مباہات کے ساتھ ذکر کیا جائیگا۔

منجملہ اُن اسباب کے جو قومی ترقی کا موجب ہوتے ہیں ایک بڑا سبب زبان کی تکمیل ہے۔ جس قدر جو قوم زیادہ ترقی یافتہ ہے اُسی قدر اُس کی زبان وسیع اور اس میں نازک خیالات اور علمی مطالب کے ادا کرنے کی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے، اور جس قدر جس قوم کی زبان محدود ہوتی ہے اُسی قدر تہذیب و شایستگی بلکہ انسانیت میں اس کا درجہ کم ہوتا ہے۔ چنانچہ وحشی اقوام میں الفاظ کا ذخیرہ بہت ہی کم پایا گیا ہے۔ علمائے فلسفہ و علم اللسان نے یہ ثابت کیا ہے کہ زبان، خیال اور

خیال، زبان ہے اور ایک مدت کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ انسانی دماغ کے صحیح تاریخی ارتقا کا علم، زبان کی تاریخ کے مطالعہ سے حاصل ہو سکتا ہے۔ الفاظ ہمیں سوچنے میں ویسی ہی مدد دیتے ہیں جیسی آنکھیں دیکھنے میں۔ اس لئے زبان کی ترقی درحقیقت عقل کی ترقی ہے۔

علم ادب اسی قدر وسیع ہے جس قدر حیاتِ انسانی۔ اور اس کا اثر زندگی کے ہر شعبہ پر پڑتا ہے۔ وہ نہ صرف انسان کی ذہنی، معاشرتی، سیاسی ترقی میں مدد دیتا، اور نظر میں وسعت، دماغ میں روشنی، دلوں میں حرکت اور خیالات میں تغیر پیدا کرتا ہے بلکہ قوموں کے بنانے میں ایک قوی آلہ ہے۔ قومیت کے لئے ہم خیالی شرط ہے اور ہم خیالی کے لئے ہم زبانی لازم۔ گویا یک زبانی قومیت کا شیرازہ ہے جو اسے منتشر ہونے سے بچائے رکھتا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب کہ مسلمان اقطاع عالم میں پھیلے ہوئے تھے لیکن اُن کے علم ادب اور زبان نے انہیں ہر جگہ ایک کر رکھا تھا۔ اس زمانے میں انگریز ایک دنیا پر چھائے ہوئے ہیں لیکن باوجود بُعدِ مسافت و اختلافِ حالات یک زبانی کی بدولت قومیت کے ایک سلسلے میں منسلک ہیں، زبان میں جادو کا سا اثر ہے اور صرف افراد ہی پر نہیں بلکہ اقوام پر بھی اُس کا وہی تسلّط ہے۔

یہی وجہ ہے کہ تعلیم کا صحیح اور فطرتی ذریعہ اپنی ہی زبان ہو سکتی ہے۔ اس امر کو اعلیٰحضرت واقدس نے

پہچانا اور جامعۂ عثمانیہ کی بنیاد ڈالی۔ جامعۂ عثمانیہ ہندوستان میں پہلی یونیورسٹی ہے جس میں ابتدا سے انتہا تک ذریعۂ تعلیم ایک دیسی زبان ہوگا۔ اور یہ زبان اردو ہوگی۔ ایک ایسے ملک میں جہاں ”بھانت بھانت کی بولیاں“ بولی جاتی ہیں، جہاں ہر صوبہ ایک نیا عالم ہے، صرف اردو ہی ایک عام اور مشترک زبان ہو سکتی ہے۔ یہ اہل ہند کے میل جول سے پیدا ہوئی اور اب بھی یہی اس فرض کو انجام دیگی۔ یہ اس کے خمیر اور وضع و ترکیب میں ہے۔ اس لئے یہی تعلیم اور تبادلہ خیالات کا واسطہ بن سکتی اور **قومی زبان** کا دعوے کر سکتی ہے۔

جب تعلیم کا ذریعہ اردو قرار دیا گیا تو یہ کھلا اعتراض تھا کہ اردو میں اعلیٰ تعلیم کے لئے کتابوں کا ذخیرہ کہاں ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہا جاتا تھا کہ اردو میں یہ صلاحیت ہی نہیں کہ اس میں علوم و فنون کی اعلیٰ تعلیم ہو سکے۔ یہ صحیح ہے کہ اردو میں اعلیٰ تعلیم کے لئے کافی ذخیرہ نہیں۔ اور اردو ہی پر کیا منحصر ہے، ہندوستان کی کسی زبان میں بھی نہیں۔ یہ طلب و رسد کا عام مسئلہ ہے۔ جب مانگ ہی نہ تھی تو رسد کہاں سے آتی۔ جب ضرورت ہی نہ تھی تو کتابیں کیونکر مہیا ہوتیں۔ ہماری اعلیٰ تعلیم غیر زبان میں ہوتی تھی، تو علوم و فنون کا ذخیرہ ہماری زبان میں کہاں سے آتا۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ اب ضرورت محسوس ہوئی ہے تو کتابیں بھی

مہیا ہو جائیں گی ۔ اسی کمی کو پورا کرنے اور اسی ضرورت کو رفع کرنے کے لئے **سررشتۂ تالیف و ترجمہ** قائم کیا گیا۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ اردو زبان میں اس کی صلاحیت نہیں ۔ اس کے لئے کسی دلیل و برہان کی ضرورت نہیں ۔ **سررشتۂ تالیف و ترجمہ** کا وجود اس کا شافی جواب ہے ۔ یہ سررشتہ یہی کام کر رہا ہے ۔ کتابیں تالیف و ترجمہ ہو رہی ہیں اور چند روز میں **عثمانیہ یونیورسٹی کالج** کے طالب علموں کے ہاتھوں میں ہونگی اور رفتہ رفتہ عام شایقینِ علم تک پہنچ جائیں گی ۔

لیکن اس میں سب سے کٹھن اور سنگلاخ مرحلہ وضع اصطلاحات کا تھا ۔ اس میں بہت کچھ اختلاف اور بحث کی گنجائش ہے ۔ اس بارے میں ایک مدت کے تجربہ اور کامل غور و فکر اور مشورہ کے بعد میری یہ رائے قرار پائی ہے کہ تنہا نہ تو ماہرِ علم صحیح طور سے اصطلاحات وضع کر سکتا ہے اور نہ ماہرِ لسان ۔ ایک کو دوسرے کی ضرورت ہے ۔ اور ایک کی کمی دوسرا پورا کرتا ہے ۔ اس لئے اس اہم کام کو صحیح طور سے انجام دینے کے لئے یہ ضروری ہے کہ دونوں یک جا جمع کئے جائیں تاکہ وہ ایک دوسرے کے مشورہ اور مدد سے ایسی اصطلاحیں بنائیں جو نہ اہل علم کو ناگوار ہوں نہ اہل زبان کو ۔ چنانچہ اسی اصول پر ہم نے وضع اصطلاحات کے لئے ایک ایسی مجلس بنائی جس میں دونوں جماعتوں کے اصحاب شریک ہیں ۔ علاوہ ان کے

ہم نے اُن اہلِ علم سے بھی مشورہ کیا جو اس کی خاص اہلیت رکھتے ہیں اور بُعدِ مسافت کی وجہ سے ہماری مجلس میں شریک نہیں ہو سکتے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض الفاظ غیر مانوس معلوم ہوں گے اور اہلِ زبان انہیں دیکھ کر ناک بھوں چڑھائیں گے۔ لیکن اس سے گزیر نہیں۔ ہمیں بعض ایسے علوم سے واسطہ ہے جن کی ہوا تک ہماری زبان کو نہیں لگی۔ ایسی صورت میں سوائے اس کے چارہ نہیں کہ جب ہماری زبان کے موجودہ الفاظ خاص خاص مفہوم کے ادا کرنے سے قاصر ہوں تو ہم جدید الفاظ وضع کریں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم نے محض ٹالنے کے لئے زبردستی الفاظ گھڑ کر رکھ دئے ہیں، بلکہ جس نہج پر اب تک الفاظ بنتے چلے آئے ہیں اور جن اصولِ ترکیب و اشتقاق پر اب تک ہماری زبان کاربند رہی ہے، اس کی پوری پابندی ہم نے کی ہے۔ ہم نے اُس وقت تک کسی لفظ کے بنانے کی جرأت نہیں کی جب تک اُسی قسم کی متعدد مثالیں ہمارے پیش نظر نہ رہی ہوں۔ ہماری رائے میں جدید الفاظ کے وضع کرنے کی اس سے بہتر اور صحیح کوئی صورت نہیں۔ اب اگر کوئی لفظ غیرمانوس یا اجنبی معلوم ہو تو اس میں ہمارا قصور نہیں۔ جو زبان زیادہ تر شعر و شاعری اور قصص تک محدود ہو، وہاں ایسا ہونا کچھ تعجب کی بات نہیں۔ جس ملک سے ایجاد و اختراع کا مادّہ سلب ہو گیا ہو جہاں لوگ نئی چیزوں کے بنانے اور دیکھنے کے عادی نہ ہوں؛ وہاں جدید الفاظ کا

غیر مانوس اور اجنبی معلوم ہونا موجب حیرت نہیں۔ الفاظ کی حالت بھی انسانوں کی سی ہے۔ اجنبی شخص بھی رفتہ رفتہ مانوس ہو جاتے ہیں۔ اول اول الفاظ کا بھی یہی حال ہے۔ استعمال آہستہ آہستہ غیر مانوس کو مانوس کر دیتا ہے اور صحت و غیر صحت کا فیصلہ زمانہ کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ لفظ تجویز کرتے وقت ہر پہلو پر کامل غور کرلیں، آئندہ چل کر اگر وہ استعمال اور زمانہ کی کسوٹی پر پورا اترا تو خود ٹکسالی ہو جائیگا اور اپنی جگہ آپ پیدا کرلیگا۔ علاوہ اس کے جو الفاظ پیش کئے گئے ہیں وہ الہامی نہیں کہ جن میں ردّ و بدل نہ ہو سکے، بلکہ **فرہنگِ اصطلاحاتِ عثمانیہ** جو زیر ترتیب ہے پہلے اس کا مسودہ اہل علم کی خدمت میں پیش کیا جائے گا اور جہاں تک ممکن ہوگا اس کی اصلاح میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا جائے گا۔

لیکن ہماری مشکلات صرف **اصطلاحات علمیہ** تک ہی محدود نہیں ہیں۔ ہمیں ایک ایسی زبان سے ترجمہ کرنا پڑتا ہے جو ہمارے لئے بالکل اجنبی ہے، اس میں اور ہماری زبان میں کسی قسم کا کوئی رشتہ یا تعلق نہیں۔ اس کا طرز بیان، ادائے مطلب کے اسلوب، محاورات وغیرہ بالکل جدا ہیں۔ جو الفاظ اور جملے انگریزی زبان میں بالکل معمولی اور روز مرہ کے استعمال میں آتے ہیں، اُن کا ترجمہ جب ہم اپنی زبان میں کرنے بیٹھتے ہیں تو سخت دشواری پیش آتی ہے۔ ان تمام دشواریوں پر

غالب آنے کے لئے مترجم کو کیسا کچھ خونِ جگر کھانا نہیں پڑتا۔ ترجمہ کا کام، جیسا کہ عموماً خیال کیا جاتا ہے، کچھ آسان کام نہیں ہے۔ بہت خاک چھاننی پڑتی ہے تب کہیں گوہر مقصود ہاتھ آتا ہے۔

اس سررشتہ کا کام صرف یہی نہ ہوگا (اگرچہ یہ اس کا فرضِ اولین ہے) کہ وہ نصاب تعلیم کی کتابیں تیار کرے، بلکہ اس کے علاوہ وہ ہر علم پر متعدّد اور کثرت سے کتابیں تالیف و ترجمہ کرائے گا، تاکہ لوگوں میں علم کا شوق بڑھے، ملک میں روشنی پھیلے، خیالات و قلوب پر اثر پیدا ہو، جہالت کا استیصال ہو۔ جہالت کے معنی اب لاعلمی ہی کے نہیں بلکہ اس میں افلاس، کم ہمتی، تنگ دلی، کوتہ نظری، بے غیرتی، بد اخلاقی سب کچھ آجاتا ہے۔ جہالت کا مقابلہ کرکے اسے پس پا کرنا سب سے بڑا کام ہے۔ انسانی دماغ کی ترقی علم کی ترقی ہے۔ انسانی ترقی کی تاریخ علم کی اشاعت و ترقی کی تاریخ ہے۔ ابتدائے آفرینش سے اس وقت تک انسان نے جو کچھ کیا ہے، اگر اس پر ایک وسیع نظر ڈالی جائے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ جوں جوں علم میں اضافہ ہوتا گیا، پچھلی غلطیوں کی صحت ہوتی گئی، تاریکی گھٹتی گئی، روشنی بڑھتی گئی، انسان میدانِ ترقی میں قدم آگے بڑھاتا گیا۔ اسی مقدس فرض کے ادا کرنے کے لئے یہ سررشتہ قائم کیا گیا ہے اور وہ اپنی بساط کے موافق اس کے انجام دینے میں کوتاہی نہ کرے گا۔

لیکن غلطی، تحقیق و جستجو کی گھات میں لگی رہتی ہے۔ ادب کا

کامل ذوق سلیم ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتا ۔ بڑے بڑے نقاد اور مبصرِ فاش غلطیاں کر جاتے ہیں ۔ لیکن اس سے ان کے کام پر حرف نہیں آتا ۔ غلطی ترقی کے مانع نہیں ہے، بلکہ وہ صحت کی طرف رہنمائی کرتی ہے ۔ پچھلوں کی بھول چوک آنے والے مسافر کو رستہ بھٹکنے سے بچا دیتی ہے ۔ ایک جاپانی ماہر تعلیم (بیرن کی کوچی) نے اپنے ملک کا تعلیمی حال لکھتے ہوئے اس صحیح کیفیت کا ذکر کیا ہے جو ہونہار اور ترقی کرنے والے افراد اور اقوام پر گزرتی ہے ۔

"ہم نے بہت سے تجربے کئے اور بہت سی ناکامیاں اور غلطیاں ہوئیں، لیکن ہم نے ان سے نئے سبق سیکھے اور فائدہ اٹھایا ۔ رفتہ رفتہ ہمیں اپنے ملک کی تعلیمی ضروریات اور امکانات کا صحیح اور بہتر علم ہوتا گیا اور ایسے تعلیمی طریقے معلوم ہوتے گئے جو ہمارے اہل وطن کے لئے زیادہ موزوں تھے ۔ ابھی بہت سے ایسے مسائل ہیں جو ہمیں حل کرنے ہیں، بہت سی ایسی اصلاحیں ہیں جو ہمیں عمل میں لانی ہیں، ہم نے اب تک کوشش کی اور ابھی کوشش کر رہے ہیں اور مختلف طریقوں کی برائیاں اور بھلائیاں دریافت کرنے کے درپے ہیں، تاکہ اپنے ملک کے فائدے کے لئے اچھی باتوں کو اختیار کریں اور رواج دیں اور برائیوں سے بچیں" *

اس لئے جو حضرات ہمارے کام پر تنقیدی نظر ڈالیں انہیں وقت کی تنگی، کام کا ہجوم اور اس کی اہمیت اور ہماری مشکلات پیش نظر رکھنی چاہئیں ۔ یہ پہلی سعی ہے اور پہلی سعی میں کچھ نہ کچھ خامیاں

ضرور رہ جاتی ہیں، لیکن آگے چل کر یہی خامیاں ہماری رہنما بنیں گی اور پختگی اور اصلاح تک پہنچائیں گی۔ یہ نقش اول ہے نقش ثانی اس سے بہتر ہوگا۔ ضرورت کا احساس علم کا شوق، حقیقت کی لگن، صحت کی ٹوہ، جد و جہد کی رسائی خود بخود ترقی کے مدارج طے کرلے گی۔

جاپانی بڑے فخر سے یہ کہتے ہیں کہ ہم نے تیس چالیس سال کے عرصے میں وہ کچھ کر دکھایا جس کے انجام دینے میں یورپ کو اتنی ہی صدیاں صرف کرنی پڑیں۔ کیا کوئی دن ایسا آئے گا کہ ہم بھی یہ کہنے کے قابل ہوں گے؟ ہم نے پہلی شرط پوری کردی ہے یعنی بیجا قیود سے آزاد ہوکر اپنی زبان کو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ لوگ ابھی ہمارے کام کو تذبذب کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں اور ہماری زبان کی قابلیت کی طرف مشتبہ نظریں ڈال رہے ہیں۔ لیکن وہ دن آنے والا ہے کہ اس ذرے کا بھی ستارہ چمکے گا، یہ زبان علم و حکمت سے مالا مال ہوگی اور اعلیٰحضرت واقدس کی نظر کیمیا اثر کی بدولت یہ دنیا کی مہذب و شایستہ زبانوں کی ہمسری کا دعوے کرے گی۔ اگرچہ اُس وقت ہماری سعی اور محنت حقیر معلوم ہوگی، مگر یہی شامِ غربت صبحِ وطن کی آمد کی خبر دے رہی ہے، یہی شب بیداریاں روزِ روشن کا جلوہ دکھائیں گی، اور یہی مشقت اُس قصر رفیع الشان کی بنیاد ہوگی جو آئندہ تعمیر ہونے والا ہے۔
اس وقت ہمارا کام صبر و استقلال سے میدان صاف کرنا،

داغ بیل ڈالنا اور نیو کھودنا ہے، اور فرہاد وار شیرینِ حکمت کی خاطر سنگلاخ پہاڑوں کو کھود کھود کر جوئے علم لانے کی سعی کرتا ہے۔ اور گو ہم نہ ہوں گے مگر ایک زمانہ آئیگا جب کہ اس میں علم و حکمت کے دریا بہیں گے اور ادبیات کی افتادہ زمین سرسبز و شاداب نظر آئے گی۔

آخر میں میں سررشتہ کے مترجمین کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اپنے فرض کو بڑی مستعدی اور شوق سے انجام دیا۔ نیز میں ارکانِ مجلسِ وضعِ اصطلاحات کا شکر گزار ہوں کہ ان کے مفید مشورے اور تحقیق کی مدد سے یہ مشکل کام بخوبی انجام پا رہا ہے۔ لیکن خصوصیت کے ساتھ یہ سررشتہ جناب مسٹر محمدؐ اکبر حیدری بی۔ اے معتمد عدالت و تعلیمات و کوتوالی و امور عامّہ سرکار عالی کا ممنون ہے جنہیں ابتدا سے قیام و انتظام جامعۂ عثمانیہ میں خاص انہاک رہا ہے۔ اور اگر ان کی توجہ اور امداد ہمارے شریک حال نہ ہوتی تو یہ عظیم الشان کام صورت پذیر نہ ہوتا۔ میں سید راس مسعود صاحب بی۔ اے (آکسن) آئی۔ اِی۔ ایس۔ ناظمِ تعلیمات سرکارعالی کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ان کی توجہ اور عنایت ہمارے حال پر مبذول رہی اور ضرورت کے وقت ہمیشہ بلا تکلف خوشی کے ساتھ ہمیں مدد دی۔

عبدالحق

ناظمِ سررشتۂ تالیف و ترجمہ (عثمانیہ یونیورسٹی)

ارکانِ دارالترجمہ

مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ناظم۔
قاضی محمد حسین صاحب۔ ایم۔ اے۔ رینگلر۔ ۔ ۔ ۔ مترجم ریاضیات
چودھری برکت علی صاحب بی۔ یس۔ سی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مترجم سائینس
مولوی سید ہاشمی صاحب۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مترجم تاریخ۔
مولوی محمد الیاس صاحب برنی ایم۔ اے۔ ۔ ۔ ۔ مترجم معاشیات
قاضی تلمذ حسین صاحب یم۔ اے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مترجم سیاسیات
مولوی ظفر علی خاں صاحب بی۔ اے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مترجم تاریخ۔
مولوی عبدالماجد صاحب بی۔ اے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مترجم فلسفہ و منطق
مولوی عبدالحلیم صاحب شرر۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مولف تاریخ اسلام
مولوی سید علی رضا صاحب بی۔ اے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مترجم قانون۔
مولوی عبداللہ العمادی صاحب۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مترجم کتب عربی

علاوہ ان مذکورۂ بالا مترجمین کے مولوی حاجی صفی الدین صاحب ترجمہ شدہ کتابوں کو مذہبی نقطۂ نظر سے دیکھنے کے لئے اور نواب حیدر یار جنگ (مولوی علی حیدر صاحب طبا طبائی) ترجموں پر نظر ثانی کرنے کے لئے مقرر فرمائے گئے ہیں۔

ارکانِ مجلسِ وضعِ اصطلاحات

مولوی مرزا مہدی خاں صاحب کوکب وظیفہ یاب سرکارِ عالی (سابق ناظم مردم شماری)

مولوی حمید الدین صاحب بی۔اے صدر دار العلوم

نواب حیدر یار جنگ (مولوی علی حیدر صاحب طباطبائی)

مولوی وحید الدین صاحب سلیم

مولوی عبد الحق بی۔اے ناظم سررشتہ تالیف و ترجمہ

علاوہ ان مستقل ارکان کے، مترجمین سررشتہ تالیف و ترجمہ نیز دوسرے اصحاب سے بلحاظ اُنکے فن کے مشورہ کیا گیا۔ مثلاً

خان فضل محمد خانصاحب ایم۔اے رنگلر (پرنسپل سٹی ہائی اسکول حیدر آباد)

مولوی عبد الواسع صاحب (پروفیسر دار العلوم حیدر آباد)

پروفیسر عبد الرحمٰن صاحب بی۔ایس۔سی (نظام کالج)

مرزا محمد ہادی صاحب۔بی۔اے (پروفیسر کرسچن کالج لکھنؤ)

مولوی سلیمان صاحب ندوی

سید راس مسعود صاحب بی۔اے (ناظم تعلیمات حیدر آباد) وغیرہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ



جامعۂ عثمانیہ کے نصاب تاریخ کے متعلق تراجم و تالیفات کا کام سررشتہ تالیف و ترجمہ کے سپرد ہے۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں مولوی سید ہاشمی صاحب رکن شعبۂ تالیف و ترجمہ نے طلبائے انٹرمیڈیٹ کے لئے ہندوستان کی ایک تاریخ لکھنی شروع کی ہے اور اسی تاریخ کا پہلا حصہ یہ کتاب ہے جس میں ہند قدیم کے حالات چند مستند انگریزی تصانیف سے اخذ کرکے بیان کئے گئے ہیں۔

چونکہ اکثر قدیم تاریخی حالات کے متعلق معلومات کا کوئی ذخیرہ یکجا موجود نہیں ہوتا اس لئے اہل فن کو اپنا گوہر مقصود حاصل کرنے میں بہت دور دور کی خاک چھاننی پڑتی ہے۔ جن دور افتادہ و منتشر ماخذوں سے اس فن میں وہ اپنی کتابیں لکھتے ہیں وہ دو قسم کے ہیں۔ ایک تو ایسے ہیں جو اسی ملک سے دستیاب ہوئے ہیں مثلاً ہندوؤں کی برائے نام پرانی تاریخیں یا اُن کی مذہبی کتابیں و حکایات یا مشہور شاعروں کا کلام مہابھارت اور رامائن ہیں جن میں مشاہیر قوم کے حالات نہایت پُرشوکت عبارت میں جوشِ عقیدت کے ساتھ بیان ہوئے ہیں

یا پرانے راجاؤں کے سکّے ہیں جن کے حروف و نقوش سے بادشاہوں کے نام، اُن کی مدتِ حکومت اور اُن کے تمدن پر غیر ملک والوں کا اثر دریافت کیا جاتا ہے۔ یا آثار قدیمہ ہیں جن کی وضع و قطع دیکھکر یا جن کے کتبوں کی عبارت پڑھکر بانیانِ تعمیر کے حالات منکشف ہوتے ہیں۔ دوسری قسم کے ماخذ غیر ملک والوں کی تصانیف ہیں۔ اسکی کیفیت یہ ہے کہ میلادِ مسیح علیہ السّلام سے کچھ کم چھ سو برس پہلے جب بودھ مذہب پیدا ہوکر ہندوستان کے باہر جنوبی اور مشرقی ملکوں میں شایع ہوگیا تو ان ملکوں سے بالخصوص چین سے اِس مذہب کے پیرو ہندوستان میں تیرتھ کے لئے آنے شروع ہوئے کیونکہ یہ ملک بانئ مذہب کا مولد و مسکن تھا۔ تیرتھ کرنے والوں کا یہ سلسلہ مدت تک قایم رہا بلکہ یہ سمجھنا چاہیئے کہ ابتک قایم ہے۔ لیکن پانچویں اور پہلی صدی قبل مسیح میں چند لوگ ایسے آئے جنھوں نے اپنے سفرنامے لکھے اور سفرناموں میں اِس ملک کے حالات بیان کئے اور یہ نوشتے یا اُن کے اجزا اِس زمانہ تک محفوظ رہ کر محققوں کو دستیاب ہوگئے اور اُن کو اپنے کام میں مدد مل گئی۔ چینیوں کے علاوہ یونانیوں نے بھی یہاں کے حالات وقتاً فوقتاً قلمبند کئے اور اسکی کیفیت یہ ہوی کہ گوتم بدھ کی وفات کے تقریباً ڈھائی سو برس بعد ایشیا میں ایک تہلکۂ عظیم پیش آیا یعنی بادشاہِ مقدونیہ اسکندرِ اعظم نے یورپ سے اٹھکر ایشیا میں ایک وسیع سلطنت قایم کی جس میں ایشیائے کوچک شام و فلسطین۔ ایران و خراسان۔ ترکستان و افغانستان یہاں تک

کہ سندھ و پنجاب بھی شامل کر لئے گئے۔ اس تعلق سے یونانیوں کا گزر ہندوستان میں ہوگیا اور انہوں نے یہاں کے حالات سے واقفیت پیدا کی۔ جسوقت اسکندر کی موت پر اُسکی سلطنت، اُسکے امرائے لشکر میں تقسیم ہوئی تو مغربی ایشیا کی کل سلطنت سلیوقس کے حصہ میں آئی۔ چونکہ فتوحاتِ اسکندری کا تعلق ہندوستان سے ہوگیا تھا اسلئے یہاں کے راجاؤں اور یونانیوں میں ملکی تعلقات پیدا ہوئے۔ شام و مصر کے سفیر اس ملک میں وقتاً فوقتاً آئے جن میں سے بعض نے ہندوستان کے حالات میں کتابیں لکھیں اور اس طرح چند صدیوں کے اندر یونانی زبان میں ایک معقول ذخیرہ ہندوستان کے متعلق معلومات کا پیدا ہوگیا جسکو علمائے مغرب نے اس فن میں ایک بیش بہا سرمایہ سمجھا۔ ان تصانیف کے صدہا سال بعد یعنی گیارہویں صدی عیسوی میں علامۂ ابوریحانِ بیرونی محمود غزنوی کے ہمراہ ہندوستان میں آیا اور یہاں کے حالات میں اپنی مشہور تصنیف "کتاب الہند" لکھی۔ اور ایسی لکھی کہ ہندِ قدیم کی تاریخ میں کوئی تالیف بغیر اس کتاب کے مطالعہ کے قطعی دشوار ہے۔ مؤلف کتابِ ہٰذا نے اُن تمام ماخذوں کو جن سے اس فن میں کتابیں لکھی جاتی ہیں نہایت حسنِ ترتیب سے اپنی تالیف میں بیان کیا ہے۔

پرانی تاریخ لکھنے میں جہاں اور مشکلات ہیں ایک یہ بھی ہے کہ واقعات ماضی کو بتقیدِ وقت لکھنا جو تاریخ نویسی کی سب سے بڑی شرط ہے اکثر غیر ممکن ہوتا ہے اولاً تو ایک زمانہ ایسا ہوتا ہے کہ جس سے پہلے کے حالات دریافت ہی نہیں ہوتے۔ پھر ایک

زمانہ ایسا آتا ہے کہ واقعات تو بہت سے دریافت ہوتے ہیں لیکن ان کے زمانہ کا ٹھیک پتا نہیں چلتا۔ چنانچہ شمالی ہند کے حالات مسیح علیہ السلام سے پانچسو ساٹھ برس پہلے کے مطلق دریافت نہیں ہوتے اور اگر کسی نے کچھ لکھے بھی ہیں تو وہ پایۂ اعتبار سے ساقط ہیں، محض قصّے اور کہانیاں ہیں۔ اب اس زمانہ سے تیسری صدی قبل مسیح تک جس قدر حالات معلوم ہوتے ہیں اُن کے زمانوں کا تعین اکثر قیاسی طور پر کیا گیا ہے یعنی کسی ایک واقعہ کے تعلق سے جس کی صحیح تاریخ معلوم ہوگئی ہے باقی واقعات کا زمانہ محض اٹکل سے لکھدیا ہے۔ جنوبی ہند کے صحیح حالات کا زمانہ اور بھی بعد کا ہے اور اُسکی تاریخیں بھی اکثر قیاسی ہیں۔ بجز ایک تاریخ کے یعنی ۳۲۶ ق م کے، جس میں اسکندر نے ہندوستان پر حملہ کیا اور کسی تاریخ کی صحت پر کامل یقین ہونا مشکل ہے۔ مگر باوجود ان مشکلات کے علمائے مغرب نے تحقیق کے میدان میں حقیقت و قیاس کے وہ وہ کرشمے دکھائے ہیں کہ ذوقِ علم کی لذت اور اہلِ فن کی تشنہ دہانی روز بروز زیادہ ہی ہوتی جاتی ہے۔

اس کتاب پر ایک نظر ڈالئے تو معلوم ہوتا ہے کہ چھٹی صدی عیسوی میں شمالی ہندوستان میں جس سے مراد آجکل کا سرحدی علاقہ شمال و مغرب، سندھ و پنجاب، آگرہ و اودھ، بنگال و بہار، صوبۂ متوسط ہے ہندوؤں کی بہت سی خود مختار ریاستیں قائم تھیں۔ مثلاً بالکل شمال میں گندھار کی ریاست تھی جسکا پایۂ تخت

راولپنڈی کے قریب ٹکسلا کا شہر قوم ٹکا کا بسایا ہوا موجود تھا۔ اسکے جنوب میں جمنا کے کنارے قوم کورو کی ریاست تھی جس کا راجدھانی اندر پرست کا شہر موجودہ دہلی سے بالکل متصل تھا۔ اسکے مشرق میں پنچال کی قوم صوبۂ اودھ اور گنگا و جمنا کے دوآبہ میں ریاست کرتی تھی۔ اندر پرست کے مغرب میں قوم مت سیر کا دور دورہ تھا۔ ان ہی سے متصل ایک اور قوم صاحب ریاست سورسین کی تھی جسکا دارالحکومت مدھورا یا متھرا کا شہر جمنا کے کنارے تھا۔ مالوے میں اونتی قوم کا راج اُجین کے شہر میں تھا جس کا نام ابھی تک یہی چلا آتا ہے۔ ایک قوم اجیکن کی تھی جس کا مقام صوبہ جات متحدہ کے شمالی علاقوں کو سمجھنا چاہیئے۔ اسکے مشہور گروہ لچھوی اور والیای تھے جنکا مستقر حکومت ویسالی کا شہر صوبۂ بہار میں مظفرپور کے قریب تھا۔ ویسالی سے شمال مغرب میں ووھیائی کی بڑی ریاست تھی ووھیائی کو کوئی اودہ یا اجدھیا سے تعبیر کرتا ہے اور کوئی ان دونوں علاقوں سے باہر کی ریاست بتاتا ہے۔ اس طرح نیپال کے علاقہ میں گورکھپور سے کسی قدر فاصلہ پر سراوتی کا شہر تھا جس میں کوسل کی قوم صاحب حکومت تھی۔ مگر ان تمام ریاستوں میں مگدہ کی ریاست صوبۂ بہار میں سب سے بڑی تھی۔

مگدہ راج کا بانی بنارس کا ایک شہزادہ سیس ناگ تھا جو پہلے گیا کے پہاڑی حصّوں پر حکومت کرتا تھا۔ اسی راجہ کی اولاد سے پانچویں پشت میں راجہ بم بسارا ہوا جس نے بہار میں

اپنا دارالریاست قایم کیا اور اس کا لڑکا اجاتستر مگدھ کا راجہ ہوا اس نے دریائے سون کے کنارے پاٹلی کا قلعہ بنایا جو آگے چلکر مگدھ کا مشہور پایۂ تخت پاٹلی پترا کے نام سے مشہور ہوا اجاتستر کی ماں لچھویوں کے حکمراں خاندان سے تھی - یہ خاندان جیساکہ اوپر آچکا ہے ملکِ بہار کے ضلع مظفرپور میں گنگا کے کنارے ایک بڑی ریاست رکھتا تھا اور اس کا دارالحکومت ویسالی - پاٹلی پتر سے ۲۷ میل کے فاصلے پر تھا جس کے کھنڈر ابتک صوبۂ بہار میں موضع حاجی پور سے ۲۰ میل کے فاصلے پر گنگا کے قریب نظر آتے ہیں - اجاتستر کی شادی شمالی اودہ میں کوسالا کے راجہ کی بیٹی سے ہوئی تھی اس شادی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مگدھ نے کوسالا پر غلبہ پاکر اور زیادہ قوت و وسعت حاصل کرلی - ویسالی میں لچھویوں کا راج شخصی نہ تھا بلکہ قوم کے شریف آدمی باہمی صلاح و مشورے سے حکومت کرتے تھے - راجہ اجاتستر کے بعد اسکا بیٹا درسک اور درسک کے بعد اسکے لڑکے اودھیا نے راج پاٹ سنبھالا - اور گنگا کے کنارے کسم پور آباد کیا جو پاٹلی پترا سے چند میل کے فاصلے پر تھا - غرضیکہ مگدھ میں جس کی ابتدا سس ناگ سے ہوئی تھی اسکی اولاد سے آخری دوراجہ بوردہن نندی اور مہانندی ہوے - اور ان کے زمانے سے اس خاندان کا نام نندی ہوگیا جس کے نو بادشاہ مگدھ کے تخت پر بیٹھے - یہانتک کہ راجہ چندرگپت کا زمانہ آگیا -

راجہ چندرگپت بڑا جلیل القدر بادشاہ گزرا ہے۔ اسی کے زمانے میں جین مت اور بودھ مت کے حالات اور اُن کے باہمی نزاعات پڑھنے میں آتے ہیں۔ مؤلف نے ان دونوں مذہبوں کے معتقدات اس موقع پر بیان کئے ہیں اور اس عہد کے تمدّن و شائستگی کے حالات بھی جسقدر لکھے ہیں وہ پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہندوستان پر اسکندرِ مقدونی کے حملے کی مختصر کیفیت بھی بہت خوبی سے بیان کی گئی ہے کہ کس طرح دریائے اٹک اترکر ٹکسلہ کے شہر سے گزرتا ہوا پنجاب میں داخل ہوا اور پھر جہلم اترکر راجہ پورس سے لڑائی میں مصروف ہوا۔ اور بیاس تک پہنچا تھا کہ وطن کو مراجعت کا حکم دیدیا۔ اس قصہ کو ختم کرنے کے بعد راجہ چندرگپت کے مفصّل حالات لکھے ہیں۔ اس راجہ سے جو سلسلہ بادشاہوں کا چلا وہ خاندانِ موریا کے نام سے موسوم ہوا۔ چندرگپت کی سلطنت عروج پر تھی کہ مغربی ایشیا کے مقدونی بادشاہ سلیوقس نے جسکا دارالحکومت شام میں تھا ہندوستان پر حملہ کیا مگر راجہ چندرگپت نے اس حملے کا ایسا جواب دیا کہ سلیوقس کو سخت نقصان پہونچا اور اقلیم اسکندری سے بلوچستان، کابل، ہرات و قندہار کے علاقے راجہ چندرگپت کے حوالہ کرنے پڑے۔ اس ناکامیابی کے بعد سلیوقس نے میگاستھنیز یونانی کو اپنا سفیر بناکر راجہ چندرگپت کے دربار میں بھیجا۔ اس سفیر نے یہاں کے حالات میں اپنی مشہور کتاب انڈیکا لکھی۔ اس کے بعد بھی ملوک سلیوقیہ سے پاٹلی پتر میں سفارتیں آتی رہیں ۲۹۸ قم میں چندرگپت کا

دورِ حکومت ختم ہوگیا اس راجہ کی سلطنت دریائے نربدا سے لیکر شمال میں تمام ہندوستان اور ہندوستان سے آگے کل افغانستان و بلوچستان تک تھی۔ مولف نے ان تمام حالات کو اپنی تالیف میں سلسلہوار بہت خوبی سے بیان کیا ہے۔

چندرگپت کی موت پر مگدھ راج کا مالک اُس کا بیٹا بندوسار ہوا۔ اسکے زمانے میں مغربی ایشیا کے بادشاہ سلیوقس نے ایک دوسری سفارت بھیجی اور اشوک پسرِ بندوسار کے عہد میں مصر کے بادشاہ بطلیموس فلا دلفیوس نے بھی اپنا سفیر روانہ کیا۔ اس زمانہ کے مفصل تاریخی حالات بیان کرنے کے بعد اس راجہ کے ذاتی اوصاف اور اسکے پایۂ تخت کی رونق اور بادشاہی محلوں اور مکانات کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔ پاٹلی پترا کے ذکر میں یونانی مورخ لکھتے ہیں کہ اسکی شان و شوکت کے سامنے سوسہ اور اصطخر بھی کچھ حقیقت نہ رکھتے تھے۔ اشوک کے ذکر میں باختر و پارتھیا یعنی بلخ و بخارا و خراسان کی یونانی ریاستوں کا اور ان کے بادشاہوں اور سیتھی قوم کے خروج کا بھی ذکر آیا ہے پھر راجہ کنشک کا حال آتا ہے اور یہاں بتایا گیا ہے کہ غیر قوموں کا اثر ہند کے لوگوں پر کس حد تک پڑا۔ راجہ کنشک کے بعد مگدہ راج کو پھر فروغ ہوا۔ اب مگدہ کا شاہی خاندان گپت کے نام سے مشہور ہوا۔ بودہ مت اور جین مت کے نزاعات جاری رہے تاآنکہ برہمن مت سب پر غالب آگیا۔ اسی زمانے میں وسط ایشیا سے تاتاری قوموں کا سیلاب ہندوستان میں آیا۔

گپت خاندان کے آخری بادشاہوں کا ذکر کرکے جس میں بکرماجیت

بڑا بادشاہ ہوا شاعر کالی داس اور اسکے کلام کی خوبیوں کا ذکر کیا گیا ہے اور چینی سیاح ہوئنگ چنگ کے سفرنامہ کا بھی خلاصہ بیان ہوا ہے اور ہندوؤں کی آخری مذہبی کتابوں کا حال لکھکر اور راجگانِ کشمیر و نیپال و قنوج و بندھیل کھنڈ وغیرہ کی آزاد ریاستوں کا ذکر کرکے راجپوتوں کے نسب سے بحث کی ہے اور پھر بنگالے کے شاہی گھرانے پال اور سین کے حالات درج کئے ہیں۔

اخیر میں دکن خاص اور باقی جنوبی علاقہ جات ہند کی تمام ریاستوں کے حالات اور ان کے نظم و نسق کے طریقوں اور علوم و فنون کا حال لکھکر تاریخ ہند کے اِس حصّہ کو ختم کردیا ہے۔

اس کتاب کو پڑھنے کے بعد مؤلف کی محنت و جانفشانی، حُسنِ انتخاب و سلیقۂ تحریر کی خوبیوں میں ذرا شبہ نہیں رہتا اور اِس کتاب کا لطف اِس وجہ سے اور بڑھ جاتا ہے کہ اُس میں ایسے ملک کے ابتدائی حالات لکھے گئے ہیں جو صدیوں سے ہمارا وطن ہے۔ لارڈ بیکن کا قول ہے کہ تاریخ کا مطالعہ انسان کی عقل بڑھاتا ہے اور جس صورت میں وہ اپنے ہی ملک اور وطن کی تاریخ ہو تو جس قدر حب وطن سے دل زیادہ متاثر ہوتا جاتا ہے اُسی قدر یہ شوق بھی زیادہ ہوتا جاتا ہے کہ اپنے ملک کی اصلی کیفیت معلوم ہو اور اُسکے ابتدائی حالات سے آگاہ ہوکر اپنی موجودہ حالت پر غور کیا جاوے کہ اگر حالت اچھی ہے تو وہ کونسی چیزیں تھیں جنھوں نے اقوامِ عالم کی میزانِ ترقی میں اسکا پلّہ بھاری رکھا اور اگر حالت خراب ہو تو ان چیزوں سے پرہیز کرے جنھوں نے

ترقی سے روکا یا ترقی کرنے کے بعد تاریکی و تنزّل کے حوالہ کیا۔ علمائے سابق و حال کو اس بات پر اتفاق ہے کہ ترقیِ عقل، تہذیبِ نفس، حفظ ملت اور اصلاحِ قوم کے لئے تاریخ کا مطالعہ بڑی چیز ہے۔ ہم کو امید ہے کہ اس کتاب کے پڑھنے سے طلباء کو اِن فوائد کا سبق ملتا رہیگا۔

محمدؐ عنایت اللہ

۳۰۔ جنوری ۱۹۲۱ء

فہرستِ مضامین

کتاب اوّل تاریخ ہند

باب اوّل

از صفحہ اوّل تا ۱۳

باب دوم

صفحہ ۱۴ تا ۳۵

باب سوّم

صفحہ ۳۶ تا ۵۳

باب چہارم

صفحہ ۵۸ تا ۷۹

باب پنجم

صفحہ ۸۰ تا ۹۴

باب ششم

صفحہ ۹۵ تا ۱۰۹

باب ہفتم

صفحہ ۱۱۰ تا ۱۴۱

ضمیمۂ باب ہفتم

صفحہ ۱۳۸

باب ہشتم

صفحہ ۱۴۲ تا ۱۶۸

ضمیمۂ باب ہشتم

باب نہم

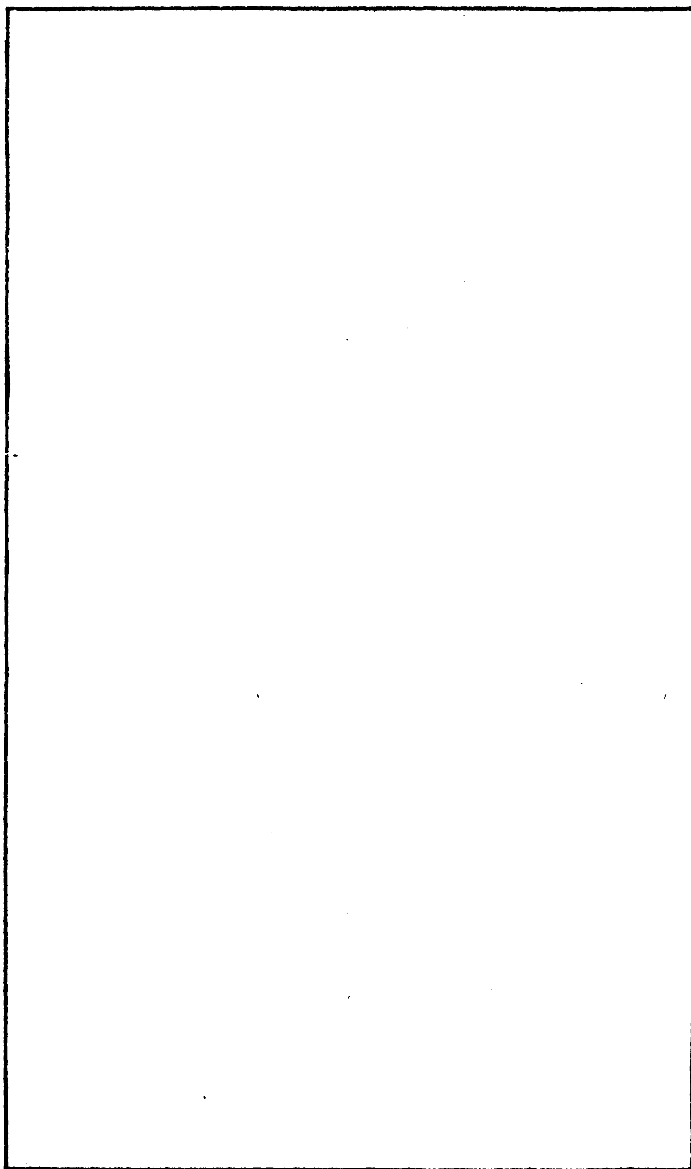
ضمیمۂ باب نہم

باب دہم

باب یازدہم

صفحہ ۲۲۳ تا ۲۴۸

تمّت



بسم اللہ الرحمن الرحیم

کتابِ اوّل تاریخ ہند

بابِ اوّل

مقدمہ (۱)

جنوبی ہند کے ایک تاریخ داں[1] نے، علم و فضل کے زور پر اپنی محبتِ وطن کا اظہار ان لفظوں میں کیا ہے :-
"ہندی تمدّن کے بنیادی عناصر کو شمالی ہندوستان کی قدیم سنسکرت پڑھ کر سمجھنے کی کوشش کرنا گویا ایک دشوار مسئلے کے حل میں اور اُلجھن پیدا کر دیتا ہے۔ کیونکہ حقیقت میں "اصلی ہند" ابھی تک بندھیا چل کے جنوب کی سرزمین یعنے جزیرہ نمائے ہند کا علاقہ ہے۔ ہند کے قدیم باشندے تعدادِ کثیر میں یہیں آباد ہیں، جو آریوں کی آمد سے پہلے کی زبانیں بولتے ہیں اور آریوں سے پہلے کے رسم و رواج رکھتے ہیں۔

---

[1] پروفیسر سندرام پلے ؛

اس میں شک نہیں کہ یہ لوگ بھی آریوں کے رنگ میں اس قدر رنگ چکے ہیں کہ موجودہ تمدّن کی بناوٹ میں دیسی تانے سے پردیسی بانے کو جدا کرنا دشوار ہے تاہم اگر یہ امتیاز کہیں ممکن ہے تو وہ اسی جنوبی ہند میں۔ اور جنوب میں ہم جس قدر زیادہ بڑھیں گے اسی قدر زیادہ یہ امکان قوی ہو جائے گا۔ پس تاریخ ہند کے محقّق کو اپنی تاریخی جستجو کرشنا اور کاویری کی وادیوں میں شروع کرنی چاہیئے۔ نہ کہ گنگا کے میدانوں میں جس کا بہت دن سے دستور پڑ گیا ہے"

مگر سوال یہ ہے کہ جنوبی ہند کے قدیم تاریخی واقعات کا بھی کوئی سراغ ہے جس کی بنا پر ہم دراوڑی زبان اور تمدّن کی قدامت کا صحیح اندازہ کرسکیں؟ قدیم تاریخ کے جو بُرے بھلے ماخذ آج تک میسر آئے ہیں، قریب قریب وہ سب شمالی ہند کے حالات سناتے ہیں اور جنوبی ہند کے واقعات کا پتہ چلتا بھی ہے تو ضمناً۔ اور یہ ظاہر ہے کہ صحیح تاریخ صرف اُن واقعات کا نام ہو سکتا ہے جن کے متعلق معتبر تحریر اور ٹھیک سن موجود ہوں۔ مذہبی قصص، عام روایات یا نظم و نثر سے اس عہد کے تمدّن کی ایک دھندھلی تصویر نظر میں پھرنے لگتی ہے مگر کچھ ضرور نہیں کہ یہ تصویر ہر شخص کی متخیلہ میں یکساں ہو۔ پس یہ مجموعہ اہل تاریخ کے نزدیک کتنا ہی دلچسپ

اور قابل قدر کیوں نہ ہو، تاریخ نہیں کہلا سکتا بلکہ اس کی بنیاد پر بہتر سے بہتر قیاس بھی اُس وقت قابل لحاظ مانا جاتا ہے جب کہ تصدیق کے لئے کوئی اور مُستند شہادت موجود ہو۔ دوسرے اگر یہ مان لیا جائے کہ شمال میں پہاڑ اور جنوب کی طرف سمندر پھیلا کر قدرت نے برِ اعظم ہندوستان کو دیگر ممالک سے علیحدہ ایک ملک بنا دیا ہے اور اختلافاتِ عظیم کے باوجود یہاں کے تمام باشندوں میں کچھ نہ کچھ یک رنگی پائی جاتی ہے، تو بھی مورّخ کی مشکل رفع نہیں ہوتی کیونکہ کسی ملک کی تاریخ کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہاں کے افراد یا گروہوں کے پریشان حالات جمع کر دیئے جائیں یا ربط و ترتیب کے بغیر ان کے رسم ورواج کے بیان پر اکتفا کی جائے۔ بے شبہ یہ چیزیں تاریخ کے لوازمات ہیں اور آج کل ان کے سمجھنے اور سمجھانے پر بہت زور دیا جاتا ہے بایں ہمہ مورّخ کا پہلا فریضہ یہی ہے کہ وہ جہاں کی تاریخ لکھنے بیٹھا ہے وہاں کی حکومت یا اربابِ حکومت کے کارنامے ترتیب زمانی کے ساتھ تحریر کر دے اور اسی ضمن میں لوگوں کی معاشرت اور دماغی حالت پر بھی اس طرح بحث کرتا جائے کہ پڑھنے والے کو ان واقعات میں اور جمہور کے اندرونی حالات و افکار میں باہم عِلّت و معلول یا لازم و ملزوم کا تعلّق نظر آنے لگے۔ لیکن اس اصول کی رُو سے بھی

"تاریخِ ہند" میں جنوبی ہند کو کوئی نمایاں جگہ نہیں مل سکتی۔ بلکہ سچ پوچھئے تو ایک اعتبار سے قدیم ہندوستان کی ایک تاریخ لکھنا ہی بے اصولی کی بات ہے کیونکہ انگریزوں کی آمد سے پہلے اس تمام ملک پر کوئی واحد حکومت نہ تھی اور کبھی کبھی کسی اقبال مند راجہ یا مسلمان بادشاہوں کا اس کے حصۂ اعظم پر سکّہ رواں ہوا بھی تو چند روز کے بعد پھر مختلف صوبے خود مختار ہو گئے اور ان میں الگ الگ حکومتیں بن گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ دورِ وسطیٰ کی فارسی تاریخیں تمام ہندوستان کی تاریخیں نہیں ہیں بلکہ الگ الگ ریاستوں یا حکمران خاندانوں کے حالات میں لکھی گئی ہیں۔ چونکہ انگریزی مصنّفین کی نظر میں اس مجموعۂ تواریخ کو ایک کتاب میں جمع کرنا جس قدر دشوار تھا اسی قدر ضروری یا دلچسپ نہ تھا، لہٰذا انھوں نے ہندوستان کی عام تاریخ میں ان کا بہت کم اور ضمناً ذکر کیا ہے اور اپنی کتابوں میں صرف ان حکومتوں کے حالات لکھے ہیں جو ہندوستان کے حصۂ اعظم پر مسلط تھیں۔ اور اس قسم کی وسیع سلطنتوں کے مرکز بلا استثناء شمالی ہندوستان میں رہے بس "تاریخ ہند" درحقیقت شمالی ہند کی تاریخ بن گئی جس کی ہمارے فاضل مدراسی پروفیسر کو شکایت ہے۔"

لیکن مشکل یہ ہے کہ مسلمانوں کے عہد سے پہلے اوّل تو ہند کے تاریخی حالات ہی کم ملتے ہیں

دوسرے جو کچھ ملتے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس دَور میں ایسی بڑی سلطنت جسے ہم مذکورۂ بالا معیار کے مطابق ہندوستان کی حکومت کہہ سکیں، شاید ہی کبھی قائم ہوی ہو ورنہ قدیم ہندوستان کا زیادہ زمانہ ملوکِ طوائف کا زمانہ ہے جس میں دیس دیس کا راجہ دعوائے خود سری رکھتا تھا اور کہیں کہیں جمہوری طرز کی حکومت تھی؛ اس انتشار و علیحدگی کے قدرتی اسباب تھے یعنی اُس عہد میں نہ تو آبادی کی اس قدر کثرت تھی نہ رسل و رسائل اور آمد و رفت کے ذریعے ایسے تھے کہ ایک مرکزی مقام سے دور دراز کے علاقوں پر فرماں روائی کی جا سکے ورنہ اس بات کی شہادتیں ملتی ہیں کہ قدیم اہل ہند کے تصور میں سارے ہندوستان کا "ایک چھتر کے نیچے" آنا ممکن یا کم سے کم قابلِ آرزو ضرور ہوگیا تھا۔

اوپر کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر ہم مِن و عن انگریز مصنّفوں کے نقشے کے مطابق اپنی کتاب مرتّب کرنی چاہیں تو قدیم تاریخ کا دائرہ تنگ ہو جاے گا اور اس میں صرف چار پانچ بڑے بڑے مہاراجوں کے حالات ہوں گے جو اپنے اپنے زمانے میں ہندوستان کے حصّہ اعظم کو زیر نگیں لا سکے تھے۔ اور چونکہ ان کے عہدِ حکومت ایک دوسرے سے بالکل جُدا اور بعید ہیں اس لئے یہ حالات باہم غیر مربوط اور بہ اعتبار سنین بالکل غیر مسلسل ہوں گے؛

حال میں بعض تاریخ نویسوں نے اس خرابی کو دور کرنے کی کوشش کی ہے اور سچ یہ ہے کہ "تاریخ" میں جب تک واقعات کی ترتیبِ زمانی موجود نہ ہو وہ محض بے جوڑ داستانوں کا مجموعہ رہ جاتی ہے اور اصلی مقصد یعنی کسی قوم کی تدریجی ترقّی یا تنزّل کے اسباب کا سراغ لگانا، فوت ہو جاتا ہے۔ پس ہم بھی چاہتے ہیں کہ حتّی الامکان ہند کے قدیم حالات کو قیدِ سنین اور ترتیبِ زمانی کے ساتھ مطالعہ کیا جائے خواہ اس میں بجائے ایک حکومت کے ہمیں ایسی متعدد ریاستوں کے مختصر حالات لکھنے پڑیں جن کا ایک دوسرے سے کوئی سیاسی تعلّق نہ تھا؛ البتہ مسلمانوں کے زمانے میں یہ شرط نبھ سکتی ہے کہ صرف اُن بڑی سلطنتوں کے حالات سے بحث کی جائے جو ہندوستان کے حصّۂ اعظم پر پھیلی ہوئی تھیں اور "سلطنتِ ہند" کے نام سے موسوم کی جا سکتی ہیں ؛

(۲)

لیکن قدیم تاریخ لکھنے میں بڑی اُلجھن اس لئے پیدا ہوتی ہے کہ ہندوؤں نے اپنی کوئی تاریخ نہیں چھوڑی اور مسلمانوں کے آنے سے پہلے اس موضوع پر ایسی کوئی کتاب نہیں لکھی گئی جس سے ہندوستان کے تاریخی واقعات کا پتہ چل سکے؛ "راجگان کشمیر" کے حالات میں بے شبہ ایک سنسکرت کتاب (راج ترنگنی) موجود ہے اور اس میں

تاریخ ہند ماخذ۔

ہندوستان کی قدیم روایات بھی جمع کی گئی ہیں لیکن اول تو وہ بارھویں صدی عیسوی کی تالیف ہے دوسرے کشمیر کے ہمعصر واقعات کے سوا اس میں ہندوستان خاص سے متعلق اکثر بے سروپا باتیں درج کردی ہیں جن پر پوری طرح اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ یہی حال نیپال و آسام کے بعض "وقائع" کا ہے اور سنسکرت، تامل یا پراکرت میں واقعات حاضرہ پر اگر کوئی تحریر ملتی ہے تو وہ ایسی شاعرانہ مثنویاں ہیں جنھیں تاریخ نہیں کہہ سکتے، بایں ہمہ اہلِ تحقیق کے لئے یہ بھی بہت کام کی چیزیں ہیں اور ان میں سب سے زیادہ قابل قدر نظم "رام چرت" ہے جو حال میں دستیاب ہوی اور بنگالے کے پال خاندان کے راجاؤں کی مدح میں لکھی گئی تھی؛

راجہ **ہرش** اور **بیر بکرماجیت** کی مدح میں بھی دو مثنویاں ملی ہیں جن میں سے ایک "ہرش چرت" ساتویں صدی عیسوی کے شروع میں لکھی گئی تھی اور دوسری غالباً بارھویں صدی کے اوائل میں تصنیف ہوی؛

سنسکرت کی شہرۂ آفاق رزمیہ مثنویاں، یعنے **مہابھارت** اور **رامائن** زمانۂ ماقبلِ تاریخ کی رسم و رواج اور ہندو تمدن کا نہایت دلکش مُرقّع دکھاتی ہیں لیکن ان کی تصنیف کے وقت یا تاریخی زمانے میں ہندوستان کی جو حالت تھی، اُس پر اِن سے کوئی خاص روشنی نہیں

پڑتی اور اس لئے مؤرخ کے لئے وہ اتنی بھی کار آمد نہیں جتنی ہندوؤں یا بودھ اور جینیوں کی بعض مذہبی کتابیں، جن میں شاہی خاندانوں کے نام اور کہیں کہیں تاریخی واقعات محفوظ رہ گئے ہیں۔

تاریخ کے ماخذ (۲)

اس ناکافی تحریری شہادت کے علاوہ جو ہندوستان پیش کرتا ہے، قدیم تاریخ کا ایک دیسی ماخذ وہ کتبے اور سکّے ہیں جن میں بعض بادشاہوں کے نام، سنینِ حکومت یا اور کوئی کام کی بات مل جاتی ہے[۱]۔ اس قسم کے کتبے

---

[۱] قدیم کتبات کے متعلق ونسنٹ اسمتھ نے اپنی تازہ ترین کتاب ''آکسفورڈ ہسٹری آوف انڈیا'' مطبوعہ ۱۹۱۹ء میں جو کچھ لکھا ہے اس کا بلفظہٖ ترجمہ کر دینا فائدہ سے خالی نہ ہوگا:-

''تاریخ کے ماخذوں کی فہرست میں سب سے پہلی جگہ کتباتِ کو دی گئی ہے اور مجموعی طور پر دیکھئے تو معلومات کا اُن سے بہتر و معتبر ذریعہ اور کوئی نہیں مگر افسوس ہے کہ اب تک ایسا کوئی کتبہ دستیاب نہیں ہوا جسے یقین کے ساتھ تیسری صدی ق م سے پہلے کا سمجھا جا سکے حالانکہ مذکورہ صدی سے بہت پہلے کے کتبات ملنے کچھ غیر ممکن نہیں ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ جو ہمارے پاس موجود ہیں انہی میں بعض عہدِ اشوک سے پہلے کے ہوں۔ قدیم ہندوستان کے یہ کتبات، جو بالعموم پتھر یا دھات پر کندہ ملے ہیں، بادشاہوں یا حکّام کی سرکاری تحریریں ہیں اور یا مختلف وجوہ سے لوگوں نے خانگی طور پر انہیں کندہ کرا دیا ہے۔ سنگی کتبے زیادہ تر کسی عمارت کی تعمیر یا کسی بت کے نصب کئے جانے کی اور یا کسی خاص واقعے کی یادگار میں کندہ کئے گئے ہیں اور اس دُوسری قسم کی یادگاروں میں کسی سیاح کے مختصر نام سے لے کر سنسکرت کے طویل قصائد تک، مختلف تحریریں کندہ کی ہوئی ملی ہیں۔ یہ قصیدے جن میں فتح مند بادشاہوں کی فتوحات کا بیان کیا گیا ہے ''پرستی'' کہلاتے ہیں۔

دھات کے کتبوں میں زیادہ تر وہ شاہی اسناد ہیں جو عطائے جاگیر کی تصدیق میں تانبے پر کھدوادی گئی تھیں۔ ان میں سے بعض (خاص کر دکن میں) بہت طویل ہیں اور ان سے بالعموم بادشاہِ وقت اور اس کے اجداد کا کچھ حال معلوم ہو جاتا ہے۔ ہندوؤں کی قدیم تاریخ میں سنین کا تعین، جس حد تک ہو سکا ہے، وہ انہی کتبات کی بنا پر کیا گیا ہے۔ × × × × × × ×'' (مقدمہ کتاب صفحہ ۱۶)

جنوبی ہند میں بہ کثرت پائے جاتے ہیں لیکن وہ اتنے پُرانے اور قابلِ قدر نہیں جتنے شمالی ہند کے کتبات ہیں جن میں سب سے مشہور مہاراجہ **اشوک** کے وہ فرامین یا پند و نصائح ہیں جنھیں اس نے تیسری صدی قبل مسیح میں چٹانوں اور سنگین مناروں پر کھدوا دیا تھا۔ ان کتبوں سے اس نامور مہاراجہ کی وسعتِ سلطنت اور اصولِ جہانبانی کے متعلق بعض نہایت مفید باتیں معلوم ہوتی ہیں اور اُس کے عہد کی تاریخ کا سب سے بڑا ماخذ وہی ہیں۔

تاریخ کے ماخذ (۳)

ہند کے قدیم آریوں نے آئندہ نسلوں کے لئے جو کچھ اپنی تاریخی یادگار چھوڑی اس کی کل کائنات یہ تھی جس کا بالاجمال اوپر بیان ہوا، اور کچھ ہندوستان پر منحصر نہیں بلکہ اس نسل کے دوسرے وطن (ایران) کا بھی یہی حال ہے کہ خود اہل ایران کی لکھی ہوی کوئی قدیم تاریخ میسر نہیں آتی حالانکہ چھٹی صدی ق م میں ان کی شاہانہ تہذیب اور وسیع سلطنت دنیا میں اپنا نظیر نہ رکھتی تھی۔ اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ گو علم و فن کی بعض شاخوں میں قدیم آریوں نے ترقیاں کیں لیکن فنِ تاریخ سے انہیں طبعاً کوئی لگاؤ نہ تھا اور اس ضروری شعبے سے غفلت برتنے کی بہ دولت دیگر اقوام کے مقابلے میں اُن کی دماغی ترقی مشتبہ ہوگئی ہے۔ باقی ہندوستان کے قدیم یا دراوڑی باشندوں کا تو ذکر ہی کیا ہے جنھیں آریوں نے مغلوب

کر کے اپنا غلام بنا لیا تھا۔

اہل ہند کی اس بے پروائی کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم ان کی تاریخ کے لئے سب سے زیادہ اُن بدیسیوں کے دست نگر ہوئے جو کسی پیرائے میں بھی اس ملک کے حالات لکھ گئے ہیں۔ ان میں سب سے پُرانا لکھنے والا **ہیرودوتس** یونانی ہے جس نے اپنی تاریخ "محاربات ایران" میں دولتِ ایران اور شمالی ہند کے سیاسی تعلقات کا ذکر کیا ہے۔ یہ امر کہ ہندوستان کے بعض علاقے ہیرودوتس کے وقت سے بھی پہلے سلطنتِ ایران میں داخل تھے، "نقشِ رستم" کے اس مشہور کتبے سے ثابت ہے جسے داریوش اوّل (یا اسفندار) نے پائے تخت اصطخر کے قریب کندہ کرایا تھا۔ (۴۸۶ق م)

یونانی ماخذ

لیکن یہ بہت مجمل حوالے ہیں اور سچ یہ ہے کہ جہاں تک ہمیں علم ہے، سکندر اعظم کے حملے سے پہلے بیرونی دنیا کو ہند کی اصلی حالت سے واقفیت کا بہت ہی کم موقع ملا تھا۔ البتہ اس کی وفات کے بعد جب مصر و شام کے بادشاہوں نے ہندوستانی درباروں میں اپنے سفیر بھیجے تو انہوں نے یہاں کے متعلق بہت کچھ حالات جمع کئے جن کے بعض حصے قدیم یونانی و رومی مصنّفین کی کتابوں میں محفوظ رہ گئے ہیں۔ ان سفیروں میں سب سے زیادہ **مگاس تھینز** کا نام مشہور ہے۔ جس کی کتاب

"اندِکا" کے بعض اجزا زمانے کی دست بُرد سے بچ گئے اور ہماری تاریخ کا سب سے قدیم ماخذ ہیں؛ خود سکندر کے ساتھ جو لوگ ہندوستان کے حملے میں شریک تھے گو اُن کی تحریریں اب ناپید ہیں، لیکن دوسری تیسری صدی عیسوی تک محفوظ تھیں اور انہی کو سامنے رکھکر ایک رومی عہدہ دار **ایریان** نے سکندر کے حملے اور ہندوستان کے حالات پر اپنی لاجواب تاریخ مُرتّب کی تھی جس میں چوتھی صدی قبل مسیح علیہ السلام تک کا ذکر ہے؛

چینی ماخذ

یونانیوں کے بعد ہم سب سے زیادہ چینیوں کے رہینِ منّت ہیں جن میں **سسو ماکیان** کو وہی مرتبہ حاصل ہے جو یونان میں ہیرودوتس کو ملا۔ اس مؤرخ نے اپنی کتاب ۱۰۰ق م کے قریب مکمّل کی تھی اور اس میں کہیں کہیں ہندوستان کا بھی ذکر آگیا ہے اور فرانسیسی مترجمین و محققین کی محنت کے طفیل ہمیں ان مجمل حوالوں سے قدیم تاریخ ہند کے سنین کی صحت میں بہت مدد ملتی ہے؛ لیکن سب سے پہلا پردیسی جس کا سفرنامۂ ہند بجنسہٖ سلامت رہ گیا **فاہیان** چینی ہے جو چوتھی صدی عیسوی کے آخر سال روانہ ہو اور ۴۰۵ء سے ۴۱۱ء تک ہندوستان میں رہا کہ بودھ مت کی تعلیم کو خاص اس کے مولد میں حاصل کرے؛ یاد رکھنا چاہئے کہ فاہیان ہند کا پہلا چینی سیاح نہیں ہے بلکہ اُس سے بھی پہلے چین کے لوگ جن میں؛

بودھ مت پھیل گیا تھا اپنے مقدّس مقامات کی زیارت کرنے یہاں آیا کرتے تھے۔ اور انہی کی زبانی روایتیں سن کر مورّخ سوماکیان نے اپنی معلومات اخذ کی ہونگی۔ لیکن ان قدیم زائرین میں کوئی ایسا علم دوست نہ ہوا جو اپنی سیاحت کے حالات لکھ لیتا، اور اگر کسی نے لکھے ہوں تو وہ بالکل بے نشان اور محو ہو گئے جن کا کسی پرانی چینی کتاب میں حوالہ نہیں ملتا۔ غرض فاہیان چینی کا نام زندہ رہا تو اس کا سبب صرف یہ ہے کہ اس نے اپنے زمانۂ سیاحت کے حالات قلم بند کئے اور "فوکیئوکی" (یعنی بودھ سلطنتوں کے حالات) نامی کتاب اپنی یادگار چھوڑی۔ اس کتاب سے ہندوستان کی تاریخ قدیم میں بڑی مدد ملتی ہے اور انگریزی میں اس کے کئی کئی ترجمے شایع ہوے ہیں لیکن اس بارے میں فاہیان سے بھی کہیں زیادہ ناموری اس کے ایک اور ہم وطن کو حاصل ہوی جو دو صدی بعد ممالکِ ہند کی سیاحت کو آیا اور ۶۲۹ء سے ۶۴۵ء تک ہندوستان کے قریب قریب ہر گوشے میں پھر کر اس نے اپنا لا جواب سفرنامہ تحریر کیا جو "مغربی دنیا کے حالات" کے نام سے یورپ کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہوا ہے۔ اس فاضل سیّاح کے نام کے متعلّق حال میں سخت اختلاف تھا اور ابھی تک یہ طے نہیں ہوا کہ اسے "ہیون چوانگ"

کہیں یا "ہوان کوان" یا "ہیوئین چوئنگ" یا ہیون تسان (تسانگ یا سانگ) جس سے وہ اوّل اوّل معروف تھا۔ بہر حال ایک محقّق کے فیصلے کے مطابق یہ آخری دونوں تلفّظ جایز ہیں اور ہم اپنی کتاب میں اُسے "ہیوئیں چوئنگ" ہی لکھیں گے ؎

اسلامی تواریخ ہندوستان کے متعلق سب سے آخر میں جس نامور مصنّف نے کتاب (تحقیق الہند) لکھکر تحقیق کا حق ادا کیا وہ علاّمہ **البیرونی** ہے ؎ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کے بعض حصّوں سے مسلمانوں کو آٹھویں صدی عیسوی ہی میں خاصی واقفیت ہوگئی تھی اور اس زمانے کی اسلامی تاریخیں قدیم ہندوستان کے متعلّق بعض کار آمد باتیں بتاتی ہیں لیکن بیرونی نے جس محنت اور سالہا سال کی تحقیقات کے بعد ہندوؤں کی علمی زبان اور علوم حاصل کیئے اس کی نظیریں خود اس زمانے میں کم ہوں گی پس اتنی وسیع واقفیت کے بعد جو کتاب اس نے تیّار کی (سنہ ۱۰۳۰ء) وہ آج بھی ہندوستان کے قدیم تمدّن اور علوم کی بحث میں مستند مانی جاتی ہے ؎

باب دوم

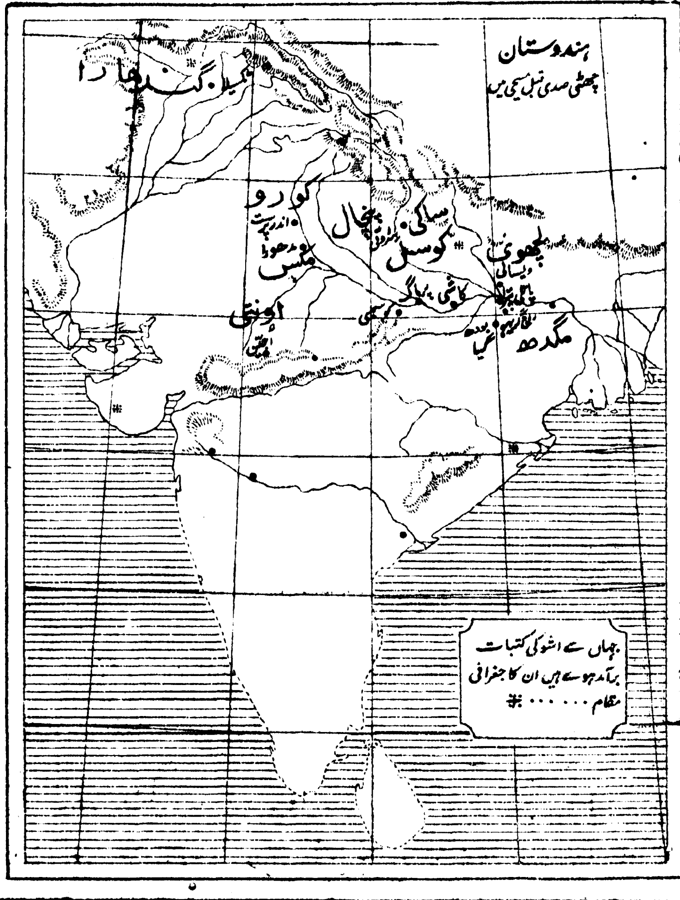
پہلی فصل:- قدیم۔ خود مختار ریاستیں

ساتویں صدی ق م سے پہلے ہندوستان کی تاریخ پر ظلمت کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ تاریخی زمانے کی وہ قوم جسے ہم آریا کہتے ہیں، کچھ خبر نہیں کہ ہندوستان میں کہاں سے آئی اور کب آئی؟ یہ قیاس کہ وہ شمال مغرب کی طرف سے آئی تھی اس لئے قابلِ تسلیم نظر آتا ہے کہ ہندوستان کے شمال مغربی حصوں میں جو لوگ آباد ہیں، اُن کا رنگ روپ اور خط و خال آریائی ہیں۔ آریائی زبانوں کا دُور دُور تک پھیلا ہوا ہونا شہادت دیتا ہے کہ اس نسل کے افراد نہ صرف ایران و ہندوستان میں آباد ہوگئے تھے بلکہ مغرب میں ممالک یورپ تک ان کے قدم پہنچے، مگر یہ بھی اس امر کا ثبوت نہیں ہے کہ جن ملکوں میں آریائی زبان پہنچی وہاں خالص آریا نسل کے لوگ آباد تھے کیونکہ خود زبان کی خوبی یا حکومت و تمدن کی برتری دوسری قوم کے لوگوں میں کسی زبان کو رواج دے سکتی ہے اور یہ لازمی نہیں کہ وہاں کے

باشندے نسلاً بھی اسی قوم کی اولاد میں ہوں جس کے قدیم الفاظ آج اُن کی زبان میں داخل ہیں؟ اس کے علاوہ ہزاروں برس تک دوسری قوموں سے میل جول اور آبادی کے بڑے بڑے انقلابات سے جو نتائج پیدا ہوئے ہوں ان کا ٹھیک اندازہ کرنا دشوار ہے اور قیاسات کا نام تاریخ نہیں ہو سکتا؟ خلاصہ یہ کہ ہندوستان کے قدیم باشندوں کی تاریخ درکنار، ہمیں خود آریوں کی آمد کے بعد سینکڑوں برس کے حالات کا صحیح علم نہیں اور چوتھی یا پانچویں صدی ق م کے جو کتبے یا مذہبی تحریریں[1] میسر آتی ہیں ان سے صرف سو سوا سو برس پہلے تک کے حالات کا کچھ سراغ چلتا ہے۔ بالفاظ دیگر ہند (اور وہ بھی شمالی ہند) کی قدیم تاریخ چھٹی صدی ق م سے شروع ہوتی ہے، اگرچہ وہ بھی نہ مفصّل ہے نہ مسلسل۔ بہت سے مقامات کی سرگذشت کا کچھ پتہ نہیں اور جہاں کے حالات ملتے ہیں ان میں بھی قیاس اور غیر معتبر روایات کا دخل ہے اور پچاس ساٹھ برس یا زیادہ کا بیچ میں وقفہ پڑ جاتا ہے کہ اس دوران میں جو واقعات پیش آئے

[1] اہل تحقیق کے نزدیک اب یہ بات قریب قریب مسلّم ہے کہ ہندوستان میں تحریر کا فن اشور و بابل سے آیا جہاں سامی قوموں کی پرشوکت سلطنتیں قائم تھیں۔ آٹھویں صدی کے خاتمے یا ساتویں صدی ق م کے آغاز میں جنوبی ہند کے تاجر وہاں کی رسم کتابت اپنے وطن میں لائے تھے لیکن اس فن کی ترویج و ترقی شمالی ہند میں ہوئی ۱۲

ان کا علم ہی نہیں ہو سکا؛ مؤرّخ کی ان معذوریوں کو پیش نظر رکھ کر ہمیں سب سے پہلے ہندوستان کے نقشے پر ایک نظر ڈالنی چاہئے اور دیکھنا چاہئے کہ چھٹی صدی ق م میں ہندوستان کی کن کن ریاستوں یا قوموں کے ناموں کا پتہ چلتا ہے تاکہ بعد کے واقعات مطالعہ کرنے میں مدد ملے:-



(۱) نقشے میں سب سے اوپر ریاست گندھارا کا نام نظر آتا ہے اور قرائن چاہتے ہیں کہ یہی لفظ بعد میں قندھار ہوگیا۔ لیکن جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں اُس وقت گندھارا میں زیادہ تر ہندوستان کا وہ ٹکڑا شامل تھا جسے آج کل "شمال مغربی سرحدی صوبہ" کہتے ہیں؛ غالباً اِس ریاست کے ہندوستان میں داخل رہنے کی وجہ یہی ہے کہ اس کا پائے تخت یا صدر مقام بھی کوہستان سلیمان کے اِس طرف یعنی موجودہ راولپنڈی کے قریب واقع اور اپنے بانی قبیلہ ٹکّا کے نام سے ٹکّا سِلا (یا ٹکسلا) موسوم تھا؛

(۲) کورو کی سلطنت، جس کا پائے تخت اِندر پرسْت موجودہ شہر دہلی کے قریب واقع تھا؛ روایتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ بودھ مت کے عروج سے چند صدی پہلے یہ سلطنت بڑے عروج پر تھی اور پنجاب میں کسی علیحدہ ریاست کا ذکر نہ آنے سے بھی قیاس ہوتا ہے کہ یہ شمالی علاقہ کورو کے زیر نگیں ہوگا؛

(۳) کورو کے مشرق میں دریائے گنگا سے کوہستان ہمالیہ تک پنچال یا پنگال قوم کی حکومت تھی اور جنوب کی طرف یہ لوگ موجودہ اودھ کے علاقہ تک دوآب میں بھی پھیلے ہوئے تھے؛

(۴) پنچالوں کے اس جنوبی علاقے اور مکس یا متسیہ قوم کے ملک میں جمنا حد فاصل بناتی تھی اور اندر پرست کے مغربی اضلاع تک انہی مکسوں کا دَور دورہ تھا؛

(۵) اگرچہ ٹھیک ٹھیک سرحدیں بتانا محال ہے، لیکن اتنا پتہ چلتا ہے کہ جمنا کے مغرب میں مکسوں کے علاوہ ایک اور قوم سُورسَین آباد تھی جن کا صدر مقام مَدھورا اسی دریا کے کنارے واقع تھا اور عجب نہیں کہ یہی لفظ بگڑ کر متھرا ہوگیا ہو۔

(۶) اونتی، جس کا پائے تخت قدیم زمانے میں بھی اُجّین (یا اجینی) تھا، موجودہ مالوے کے علاقے کو کہتے تھے۔ آریا نسل کے لوگوں کا مغرب اور جنوب میں گوداوری تک بعض مقامات پر جا بسنا بھی ثابت ہوتا ہے لیکن یہ نو آبادیاں غالباً بہت بعد کے زمانے میں بسیں اور نو وارد آریا اوّل اوّل ہندوستان میں صرف مالوے تک پھیلے تھے۔

(۷) وجّیئن قوم کے لوگ موجودہ صوبہ جات متحدہ کے شمالی علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے اور ان کے دو سب سے قوی اور مشہور جتھے لچھوی[۱] یا لکھوی اور والبائی کہلاتے تھے۔ ان کا سب سے بڑا مرکز ویسالی نامی شہر تھا

[۱] لچھویوں کے متعلق ونسنٹ اسمتھ کا خیال ہے کہ وہ نسلاً اہل تبت کے "منگولی" خاندان سے ہیں۔ ان کا اپنے مُردوں کو میدان میں ڈال دینا یا درختوں پر باندھ دینا، اور اسی طرح بعض جرائم کی سزائیں اہل تبت کے رسم و رواج سے مشابہ ہیں اور دیگر قرائن سے بھی مذکورۂ بالا قیاس کی تصدیق ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ ونسنٹ اسمتھ کے نزدیک "گمان غالب یہ ہے کہ لچھوی قوم کے قبیلۂ ساکی (ساکیا) کا مشہور مُنی گوتم بودھ "منگولی" (یا مغلیہ) نسل کا آدمی تھا!" (آوکسفورڈ ہسٹری آوف انڈیا ۱۹۱۹ء ص ۴۷)

جس کا بعض اہل تحقیق نے موجودہ ضلع مظفرپور (بہار) میں اس مقام پر کھوج نکالا ہے جہاں آج کل قصبہ بساڑھ آباد ہے۔ یہ نہایت وسیع و با رونق شہر تھا اور اس کے گرد تین تین فصیلیں بنی ہوئی تھیں۔ وجّین قوم کے بڑے بڑے رئیس و راجہ اسی مقام پر رہتے تھے اور اُن کا دوسرا مستقر متصلا ویسالی کے کچھ اوپر شمال مغرب میں آباد تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ یہاں وِدیہائی گروہ کے لوگوں نے ایک مستقل ریاست الگ بنالی تھی جسے ودیہا کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ لفظ بعد کی بھاشا میں وِدھ رہ جائے گا اور اس میں اور اَوِدھ میں جو مناسبت ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ بعض شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ گَوتم بودھ کے وقت میں یہاں بہت وسیع اور جمہوری طرز کی سلطنت تھی۔ پس کیا عجب کہ انقلابات زمانہ سے اس سلطنت کا نام اس کے صرف ایک صوبے (اودھ) میں یادگار رہ گیا ہو کیونکہ قدیم تاریخ میں اس قسم کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ اس سے بھی زیادہ قوی قیاس یہ ہو سکتا ہے کہ اس لفظ میں الف "غیریت" کا ہے۔ (اَودھ یعنی وہ علاقہ جو وِدھ کے باہر یا غیر ودھ ہو) لیکن جدید مغربی محقّقین میں سے کسی کا خیال ادھر نہیں گیا اور بعض مصنّف اَودھ کو اَجُدھیا کی بگڑی ہوئی صورت بتاتے ہیں، اور اس میں شک نہیں کہ جو علاقہ اب اودھ کہلاتا ہے وہاں ان دنوں ایک علیحدہ

سلطنت قائم تھی جس کی سلطنت مگدھ کے ساتھ کشمکش کا حال ہم آگے پڑھیں گے۔

(۸) یہ **کوسل** کی سلطنت تھی جس کا پائے تخت ساوتی یا سراوتی، غالباً موجودہ شہر گورکھپور سے کوئی ستّر میل اوپر (گویا نیپالی علاقے میں) واقع تھا۔ چھٹی صدی ق م میں یہ ہندوستان کے چھ بڑے شہروں میں گِنا جاتا تھا اور گَوتم بودھ کے بہت سے واقعات زندگی کا اس شہر سے تعلق بیان کیا گیا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ ابھی تک اس کی جائے وقوع یقین کے ساتھ معلوم نہیں ہوی حالانکہ امید ہوتی ہے کہ وہاں بودھ مت والوں کی کچھ نہ کچھ پرانی یادگاریں اور کتبے ضرور زمین کے نیچے مدفون پڑے ہوں گے۔

(۹) لیکن زمانۂ تاریخی کی سب سے بڑی اور قوی سلطنت دریائے گنگا کے نیچے اس علاقے میں قائم تھی جو آج کل بہار کے صوبے میں داخل ہے۔ غالباً اوّل اوّل اس کی مغربی حدِ فاصل سون ندی تھی اور جنوب میں بندھیاچل کے پہاڑوں کا وہ سلسلہ جو چھوٹے ناگپور میں پھیلا ہوا ہے۔ لیکن بعد میں اس نے بڑی قوّت و وسعت حاصل کی اور ہماری تاریخ کے اس باب میں زیادہ تر اسی سلطنت کا ذکر آئے گا۔ فا

فا مذکورہ بالا نو ریاستوں کے علاوہ بودھوں کی روایات اور پرانوں میں اور سات ریاستوں یا خود مختار قوموں کا نام بھی آیا ہے اور یہ قدیم فہرست مکمل سولہ ناموں پر مشتمل ہے۔ لیکن جن قوموں کا دائرہ حکومت بہت تنگ تھا یا جو دوسری ریاستوں کی ماتحت بن گئیں، انہیں ہم نے نظر انداز کر دیا ہے۔ ۱۲

دوسری فصل: مگدھ کی سلطنت کا پہلا دور

اوّل اوّل یہ بہت چھوٹی ریاست تھی اور تاریخی زمانے میں یہاں سب سے پہلے سیس ناگ راجہ کا خاندان فرماں روائی کرتا تھا۔ لیکن ساتویں اور چھٹی صدی ق م میں جو ہندوستان کے عقلی تلاطم اور دماغی تگ ودَو کا گویا پہلا تاریخی دور ہے، ذہنی ترقی کا تمدّن و سیاسیات پر اثر پڑنا لازمی بات تھی۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ اہل ہند کے افکار میں اسی ہیجان کی تحریری شہادتیں باقی ہیں جن کے طفیل ہم اُس عہد کے سیاسی حالات کا کچھ سراغ چلا سکے ورنہ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، خاص اس موضوع (تاریخ) پر ہندوستان میں کوئی کتاب نہیں لکھی گئی ہو

بہر حال، بانیٔ خاندان کے نام کے بعد مگدھ کا سب سے پہلا راجہ جس کے حالات ہم تک پہنچے، بِم بِسار ہے جو اپنے مورثِ اعلیٰ سیس ناگ کی پانچویں پشت میں تھا۔ اپنے پائے تخت کو مستحکم کرنے کے بعد اسی نے ملک ستانی پر کمر باندھی اور انگا کی ریاست کو فتح کرکے اپنی سلطنت میں شامل کرلیا (یہ چھوٹی سی ریاست مگدھ کے ہمسائے میں قریب قریب اسی علاقے میں تھی جسے اب ضلع بھاگلپور کہتے ہیں) پھر بم بسار نے کوسل کی راج کماری سے شادی کی اور دوسرا بیاہ لچھویوں کے طاقتور قبیلے میں کیا جس سے اس کی قوّت میں اضافہ ہوا۔

بم بسار راجہ

اور بودھوں کی روایت کے بہ موجب اسے خود اس کے بیٹے اَجَاتَستر نے مار کر بادشاہی لی، تو مگدھ پہلے کی نسبت کہیں زیادہ طاقتور سلطنت بن گئی تھی۔ بم بسار کے متعلق اتنا معلوم ہے کہ اس نے اٹھائیس برس راج کیا لیکن اس کی تخت نشینی (۵۸۲ھ ق م) اور موت (۵۵۴ھ ق م) کے سن قیاسی ہیں اور بیٹے کے ہاتھ سے مارا جانا بھی کسی قدر مشتبہ یا کم سے کم مبالغہ آمیز روایات پر مبنی ہے کیونکہ اوّل تو اجاتستر کی ماں، وَرَدْھ مَانْ مَہابیر Varadhamana mahavira کی رشتہ دار تھی اور یہ شخص جَین مت کا بانی اور اس لئے گئوتم بودھ کا حریف و ہم عصر گزرا ہے۔ دوسرے روایتوں میں (پدرکشی) کے جرم قبیح کی اغوا کرنے والا دیودت کو بتایا گیا ہے جو گئوتم کا عزیز قریب اور آخر میں سخت مخالف ہو گیا تھا چنانچہ اس نے بودھ مت کے توڑ پر ایک مذہبی فرقے کی بنا ڈالی تھی جو ساتویں صدی عیسوی تک ہندوستان میں موجود رہا۔

اجاتستر مذکورہ بالا روایات میں اسی (پدرکشی) کو آجاتستر[۲]

---

[۱] یہ اور اس باب کے تمام سنین اوکسفورڈ ہسٹری اوف انڈیا مطبوعہ ۱۹۱۹ء کی تازہ ترین تحقیقات کے مطابق صحیح کر لئے گئے ہیں اور ان میں پہلے کی تمام انگریزی تاریخوں سے فرق ہے۔ مؤلف

[۲] اس کتاب میں ہم نے ہندی کا آسان تلفظ اختیار کیا ہے اور کہیں کہیں اصلی یا سنسکرت تلفظ انگریزی (رومن) حرفوں میں لکھ دیا ہے کہ اسے پہچاننے میں دقّت نہ ہو۔ ۱۲

(Ajatasautr) کی پہلی جنگ کا سبب قرار دیا گیا ہے۔ یہ جنگ کوسل کے راجہ سے ہوی تھی جس کی بہن مقتول بمبسار کی رانی، یعنی اجاتستر کی سوتیلی ماں تھی اور اپنے شوہر ہی کے غم میں جان سے گزر گئی۔ کوسل کا راجہ بہن اور بہنوی کا انتقام لینے کے لئے آمادۂ جنگ ہوا لیکن عرصۂ دراز کی کشمکش کے بعد قرینہ کہتا ہے کہ غلبہ مگدھ کے نوجوان راجہ کو حاصل ہُوا اور کوسل کے بوڑھے فرماں روا کو دب کر صلح کرنی پڑی۔ اس قدر تو روایتوں میں بھی تحریر ہے کہ اس نے اپنے شاہی خاندان کی بیٹی اجاتستر کو بیاہ دی تھی۔ لیکن بعد کی تحریروں میں کوسل کی سلطنت کا کوئی ذکر نہیں آتا اور چوتھی صدی ق م میں یہ تمام ملک مگدھ کی سلطنت کا جزو نظر آتی ہے۔ پس یہ نتیجہ بعید از عقل نہیں کہ اسی جنگ نے کوسل کی قوّت توڑی اور مگدھ کو اس کا جانشین، یعنی قدیم ہند کی سب سے قوی سلطنت بنا دیا۔ اجاتستر کی آئندہ مہمات بھی مذکورۂ بالا قیاس کی تائید کرتی ہیں کہ اپنے سوتیلے نانا پر فتح پاکر وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا اور گنگا اُتر کر شمال میں لچھویوں پر چڑھائی کر رہا تھا جن کی فوجی قوّت اور ثروت کی ان دنوں بڑی دھاک تھی۔ یہ آزاد اور جنگ جو قبائل بھی مگدھ کے نوخیز فاتح کا حملہ نہ روک سکے اور اجاتستر نے ان کا صدر مقام ویسالی چھین لیا۔ بعض روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اجاتستر کی ماں یہیں کے راجہ چیٹک کی بیٹی تھی لہٰذا کچھ عجب نہیں کہ یہ ننھیالی

رشتہ بھی ملک پر قابض ہونے میں کار آمد ثابت ہوا ہو۔ بہر حال اس میں کوئی شک نہیں معلوم ہوتا کہ اجاتستر نے مگدھ کا علاقہ کوہستان ہمالہ کے دامن تک وسیع کر دیا تھا اور اپنی شمالی مقبوضات کی حفاظت کے لئے، سون اور گنگا کے سنگم کے پاس وہ جنگی قلعہ بنایا تھا جس کے گرد بعد میں پاٹلی پترا نامی قدیم ہند کا سب سے مشہور شہر آباد ہوا۔

اجاتستر کے جانشین

اقبال مند اجاتستر نے غالباً ۵۲۷ھ ق م میں وفات پائی اور گو خود اس کی اولاد میں کوئی ایسا اولوالعزم راجہ نہ ہوا کہ مگدھ کی فتوحات کا سلسلہ جاری رکھتا، تاہم جو قوت و عظمت اس مشرقی سلطنت نے اجاتستر کے عہد میں حاصل کر لی تھی وہ بعد میں بھی کم نہ ہوی اور اسی ملک کے وارث ہونے کے بعد موریا خاندان کے راجاؤں کو تمام ہند کے فتح کرنے کے ولولے پیدا ہوئے۔

مگر موریا خاندان کا ذکر اپنی جگہ پر آگے آئے گا۔ یہاں ہمیں اجاتستر کے ان جانشینوں کے نام گنا دینے چاہئیں جو قیاساً ۴۱۳ھ ق م تک مگدھ میں بادشاہی کرتے رہے۔ ان میں پہلے دو، یعنی درسک Darsaka اور اُدے Udaya کے تو کچھ حالات ملتے بھی ہیں لیکن ان کے بعد کے دو جانشینوں کا محض نام ہی نام باقی ہے۔ یعنی نندی وردھن اور اس کا بیٹا مہانندن۔ اور وہ راجہ نند جو نند خاندان کا بانی سمجھا جاتا ہے ایک نیچ ذات کی

عورت سے، اسی مہانندن کا بیٹا تھا؛ کم نسل ہونے کی وجہ سے وہ مسندِ شاہی کا جائز وارث نہ تھا اسی لئے جب اس نے کسی طرح راج پر اپنا قبضہ جمالیا تو "سیس ناگ خاندان" کا بھی کہنا چاہیئے کہ خاتمہ ہوگیا اور نند (Nanda) خاندان کی حکومت شروع ہوی (قیاساً ۴۱۳ ق م)

نند خاندان اس خاندان کے متعلق پرانوں میں جا بہ جا گردشِ زمانہ کی شکایت ملتی ہے کہ آسمان کی سفلہ پروری نے "چھتریوں" کی بجائے "شودروں" کو تخت حکومت پر لا بٹھایا۔ لیکن اس کے بادشاہوں کے ٹھیک ٹھیک نام اور واقعات کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ تاہم اس بات کی بعض شہادتیں موجود ہیں کہ گو اس خاندان کے راجہ برہمنوں کے دشمن اور غالباً اپنی رعایا میں غیر ہر دلعزیز تھے[1]، لیکن فوجی قوت کی ان کے پاس کمی نہ تھی اور ان کا تموّل ضرب المثل ہو گیا تھا؛ سکندر اعظم نے ہندوستان پر حملہ کیا ہے تو اس وقت بھی اسی خاندان کا کوئی راجہ مگدھ پر حکومت کرتا تھا۔ یونانی مصنّفوں نے اس کا نام "زندرامس" بتایا ہے اور کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ اصلی نام کیا تھا۔ قدیم یونانی نام بگاڑ نے میں

---

[1] برہمنوں یا ہندوؤں کو اس خاندان شاہی سے جو نفرت تھی اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے سمّت سے وہ نوّے برس کم کر دئے جس میں نند خاندان کے راجہ برسرِ حکومت رہے۔ سنین کے اسی طرز شمار کو "انند" (یعنی نند کے علاوہ) کہتے ہیں۔ دیکھو اوکسفورڈ ہسٹری صفحہ ۵۰

سخت بدنام ہیں مگر زیادہ افسوس یہ ہے کہ اس بارے میں سُنی سنائی اور بے ربط باتوں کے سوا کوئی ایسی روایت بھی ان کو نہیں ملی جس سے نند خاندان کی تاریخ کا سراغ لگانے میں ہمیں مدد ملتی۔ البتہ اتنا یقینی ہے کہ خبر دینے والوں نے سکندر سے جن الفاظ میں مگدھ کی زبردست فوج کا بیان کیا تھا اسے سن کر مقدونیہ کے تھکے ہارے سپاہی اور بھی بد دل ہوے، اور انہوں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔

الغرض جو بُری بھلی شہادتیں ملتی ہیں انہیں جوڑ کر جدید اہل تحقیق اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس خاندان کے نو راجہ نوّے یا اکانوے برس تک فرمان روائی کرتے رہے اور غالباً ۳۲۲ ق م میں انہی کے ایک رشتہ دار (چندر گپت) نے نند خاندان کے آخری تاجدار[1] کو معزول کر کے سلطنت پر قبضہ کر لیا اور اُس خاندان شاہی کی ابتدا ہوی جو "موریا" کہلاتا ہے۔

مگدھ کی تاریخ کو یہاں تک لکھنے کے بعد، مناسب ہوگا کہ "موریا خاندان" یا سلطنت مگدھ کے آیندہ فروغ کا ذکر، ہم سکندر اعظم کے حملے کے بعد کریں اور اس فصل میں وہ واقعات ایزاد کریں جو پانچویں صدی ق م میں

---

[1] برہمنوں کی لعن طعن اور دیگر شواہد سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آخری نند راجہ بودھ یا جین مت کا پیرو تھا۔ اوکسفورڈ ہسٹری صفحہ ۵۹

ہندوستان کے شمال مغربی حصے میں گزرے اور ان کا حوالہ ہمارے دیسی یا بدیسی ماخذوں میں باقی رہ گیا۔

ایرانی فتوحات

دارائے گشتاشپ (یا اسفندار) کے کتبے کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ اس میں یہ ایرانی شہنشاہ اپنے مقبوضات میں "ہندوستان" کا نام بھی شمار کرتا ہے اور اس میں کوئی کلام نہیں کہ اس کے لشکر گراں میں ہندی تیر اندازوں کا بھی ایک دستہ شامل تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایرانیوں نے اوّل اوّل سندھ اور پنجاب کے حالات دریافت کرنے کی غرض سے ایک بحری مُہم روانہ کی تھی اور پھر یہ تمام علاقہ فتح کر کے، اسے دولت ایران کا ایک صوبہ یا ستراپی بنا لیا تھا، جس کی سالانہ آمدنی تین سو ساٹھ تیلنت یعنی آج کل کی دس لاکھ انگریزی اشرفی کے برابر ہوتی تھی۔ اس کی حدود کا ٹھیک پتہ نہیں چلتا مگر یہ واضح رہے کہ یہ ستراپی آیریہ (یعنی موجودہ ہرات) اراکوسیہ (یعنی صوبۂ قندھار) اور گندھارا (یعنی شمال مغربی پنجاب) کے علاوہ تھی اور اس لئے موجودہ ملک سندھ اور شاید پنجاب کا وہ حصہ اس میں شامل تھا جو آج کل "قسمت ملتان" میں داخل[1] ہے۔

[1] داریوش کے ایرانی عہدہ دار ہی اس علاقے میں ممالک شام و عراق (قدیم "ارام") کی طرز تحریر لائے تھے جسے "آرامی" کہتے ہیں اور وہی مقامی تغیرّ و تبدّل سے "خرشتی" تحریر بن گئی جس کے بہت سے کتبے گندھارا و ختن میں دستیاب ہوئے ہیں۔ واضح رہے کہ ہندوستان میں سب سے پہلے جو طرز تحریر (براہمی) مُروّج ہوی وہ بھی انہی سامی ممالک سے یہاں آئی تھی اور پرانی دیوناگری کے حروف اُسی کی ترقی یافتہ صورت ہیں (انسائکلو۔ جلد اوّل صفحہ ۷۳۱)

تیسری فصل + تمدّن اور معاشی حالات

شہر اور عمارات

مگدھ کے پائے تخت "راج گاہ" (یا راج گریہہ) کے قریب رگری برج نامی ایک مضبوط پہاڑی قلعہ تھا اور چھٹی صدی ق م کی پتھر کی عمارتوں میں سے اگر کسی کے کچھ آثار باقی رہ گئے ہیں تو وہ اسی قلعہ کے، جس کا دَور ساڑھے چار میل کے قریب تھا۔ قدیم کتابوں سے مستحکم برج و حصار اور شہر پناہ کے عالیشان دروازوں کا سراغ ملتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فصیلوں کے گرد دُھس اور پھر چوڑی چوڑی خندقیں بنائی جاتی تھیں لیکن غالباً یہ شہر کے اندرونی قلعوں کا بیان ہے جن میں شاہی محل اور قلعے کی فوج رہتی ہوگی۔ پروفیسر رہس ڈیوڈز (جس کی کتاب بدھسٹ انڈیا کے بعض ابواب سے ہم نے اس فصل کے لکھنے میں استفادہ کیا ہے) کا خیال ہے کہ شہر کی اصلی آبادی، لوگوں کے مکانات اور بازار اِن قلعوں کے باہر ہوتے تھے اور ہندوستان کے بعض پرانے قصبوں میں آج بھی آبادی کا یہی نمونہ موجود ہے۔ چوتھی صدی ق م میں شاہی عمارات کی جو صورت ہوتی تھی، اس کا یونانی سفیر مگاس تھینز نے تفصیل سے حال بیان کیا ہے اور اس کا ضروری خلاصہ ہم اپنی پہلی کتاب میں لکھ آئے ہیں۔ لیکن یہاں ہمیں راجہ مہاراجوں کے

محلات کی بجائے عوام الناس کے مکانات کا مطالعہ کرنا ہے تاکہ اس عہد کی معاشرت کا ٹھیک اندازہ ہو سکے۔

ہماری اس معلومات کا ماخذ بیش تر وہ مذہبی کتب و روایات ہوں گی جن میں ضمناً شہر اور شہر کے مکانات کا ذکر آگیا ہے۔ اور یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ اس زمانے میں شہر صرف ذاتی مکانات و دکانات کا مجموعہ ہوتا تھا اور اس قسم کی عمارتیں شاذ و نادر ہی نظر آتی تھیں جنھیں لوگوں کا مال مشترکہ سمجھا جائے۔ منادر و معابد کا ابھی تک رواج نہ تھا اور سرکاری کاروبار راجہ کے محل میں انجام پاتے تھے۔ ان کے لئے نہ کوئی دفتر ہوتا تھا نہ کچہری۔ البتہ بالعموم بعض چوراہوں پر یا شہر کے باہر اس قسم کے "آنک ستسان" یا "سیوتھکا" کے گنبد بننے لگے تھے جن میں کسی مشہور آدمی کی راکھ یا "بھسمی" دفن ہوتی تھی اور گو ایسی کسی عمارت کے کھنڈر بھی اس حالت میں باقی نہیں ہیں کہ ان کا کوئی صحیح خاکہ پیش کیا جا سکے تاہم اتنا پتہ چلتا ہے کہ بعض اوقات یہ گنبد بہت بڑے بنائے جاتے تھے اور ان میں پتھر یا اینٹ بھی لگائی جانے لگی تھی؛ لیکن یہ مسالا اس زمانے میں عام طور پر استعمال نہ ہوتا تھا بلکہ رہنے کے مکانات لکڑی سے بنائے جاتے تھے اور ان کے اندر باہر چونے کا صندلا کر دیا جاتا تھا اور نقاشی اور مصوری کی جاتی تھی جس کے بعض لاجواب نمونے گواہی دیتے ہیں کہ ان دنوں ہندوستان میں

یہ فن بہت کچھ ترقی کر گیا تھا۔

مکانات کا عام طرز

آج کل انگریزوں کی دیکھا دیکھی ہمارے ہم وطن ایسے مکانات بناتے ہیں کہ بیچ میں رہنے کی عمارت، اور اِدھر اُدھر صحن ہوتا ہے۔ دراصل یہ مسلمانوں کے باغ اور بارہ دری کی نقل ہے ورنہ سکونت کے مکانوں کا عام نقشہ جو اس ملک میں بہت قدیم سے چلا آتا ہے، یہی ہے کہ چاروں طرف مکان اور بیچ میں صحن رکھتے ہیں۔ یہی طرز چھٹی صدی ق م میں تھی اور عام طور پر دو منزلہ مکانات بنائے جاتے تھے جن کی کھڑکیاں باہر گلی یا بازار میں کھلتی تھیں۔ عوام الناس اور غریبوں کے مکان خس پوش اور یک منزلہ ہوتے تھے اور معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں شہر میں کثرت اسی قسم کے مکانات یا چھپروں کی ہوتی تھی۔

معاشی حالت

لیکن اس بات کے تحریری ثبوت موجود ہیں کہ ان "تنگ وبودار مکانوں" کے رہنے والے بھی معاش کے اعتبار سے مطمئن اور آسودہ حال تھے۔ ہندوستان زرعی ملک ہے اور اُس زمانے میں بھی یہاں کی زیادہ آبادی دیہات میں رہتی اور زراعت پر گزارہ کرتی تھی۔ کاشت کے لئے زمین کی کچھ کمی نہ تھی اور جہاں تک معلوم ہُوا، نہ صرف کسان بلکہ چرواہے اور گلہ بان بھی ان دنوں آزادی اور کمال فراغت سے زندگی بسر کرتے تھے۔ مزدوری کا پیشہ، یعنی اُجرت پر دوسرے کی خدمت کرنا موجبِ ننگ اور بدنصیبی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔

لونڈی غلاموں کا پرانی کتابوں میں جا بہ جا ذکر آتا ہے لیکن قرائن کہتے ہیں کہ یہ زیادہ تر بڑے اُمرا کے پاس شہروں میں ہوتے تھے اور غالباً ہند کی قدیم دراوڑی نسل کے افراد تھے ؏

شمالی ہند کے شہروں کا شمار چودہ، پندرہ یا اس کے قریب قریب تھا اور اگرچہ اُن کی آبادی کا تخمینہ محال ہے اور اُس زمانے کے شہر اور قصبے میں امتیاز کرنے کا کوئی عمدہ ذریعہ نہیں، تاہم بعض شہر بہت با رونق اور آباد تھے اور اُن میں متموّل سوداگر بستے تھے جن کا تجارتی مال بیل گاڑی میں یا کبھی کبھی کشتیوں پر دُور دُور تک آتا جاتا تھا۔ راہ داری کے محصولات اس زمانے میں ایسے سخت تھے کہ صرف قیمتی اشیا ہی کی درآمد برآمد ممکن تھی۔ دُوسرے نہ سڑکیں تھیں نہ اس قدر آبادی کہ مال کا بہ حفاظت ایک جگہ سے دُوسری جگہ لے جانا آسان ہو۔ راستے کی حفاظت کے واسطے خود سوداگروں کو سپاہی ساتھ کرنے پڑتے تھے[1] اور انہی بالائی مصارف کے باعث تجارت کا مال صرف ریشمی، باریک سوتی یا کام دار کپڑے اور زیورات پر مشتمل ہوتا تھا ؏

---

[1] سکہ بھی ابھی تک سرکاری طور پر رائج نہیں ہُوا تھا۔ البتہ خود سوداگروں کے ڈھالے ہوئے مسی سکّے اور ہنڈویاں عام طور پر چلتی تھیں ؏ ۱۲

صناعات اور اہل حرفہ

لباس، زیورات اور ظروف کے حالات پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ چھٹی صدی ق م میں اہل ہند خاصے دستکار ہو گئے تھے۔ مثال کے طور پر خود ہمارے زمانے کی دیہاتی معاشرت میں دیہاتیوں کو جس قسم کے لباس اور اسباب تکلّفات کی ضرورت پڑتی ہے وہ اُس وقت بھی غالباً کوسمبی یا بنارس کے بازاروں میں فراہم ہو سکتے تھے۔ ان قدیم صنعتوں (خاص کر زیورات) کے جو نمونے موجود ہیں وہ کچھ بہت بھدّے نہیں اور اِس زمانے کی دیہاتی صنعتوں سے مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا قدامت پرست ملک آج بھی ضروریاتِ تمدّن اور ذوقِ آرائش کے اعتبار سے قریب قریب اسی عالم میں ہے جس میں ڈھائی ہزار برس پہلے مگن تھا۔

پیشہ ور سپاہی اور سرکاری ملازمت کرنے والوں کو چھوڑ کر اہل حرفہ کی دس بارہ قسمیں بتائی گئی ہیں، فیلبان، رتھبان، دھوبی، حجام ان کے علاوہ ہیں، ان پیشہ وروں کی اُسی زمانے میں باقاعدہ ذاتیں بن گئی تھیں بلکہ شہر کے اندر یا بیرونی علاقے میں ان کی ہر برادری گویا ایک چھوٹی سی قوم ہوتی تھی جو اپنے معاملات اور قضئے خود چکاتی اور گاؤں[1] کی پنچایتوں کی طرح اپنے برادری والوں کو سزا دینے کی مجاز تھی۔

---

[1] خود گاؤں کی آبادی اُس زمانے میں ایک برادری یا ایک خاندان کے افراد پر مشتمل ہوتی تھی ۱۲

برادری کے چودھری یا مکھیا بہت معزز مانے جاتے تھے اور بعض اوقات خود راجہ کے دربار میں ان کا بڑا رسوخ ہوتا تھا۔

ذات و رنگ کا امتیاز

اوپر کے بیان کو پڑھ کر یہ بات ازخود ذہن میں آجاتی ہے کہ ہندوستان میں اس ذات بندی کا بیج اُسی وقت پڑ چکا تھا، جسے آج کل اکثر مصلحین قومی اتحاد کا سب سے سخت دشمن جانتے ہیں۔ چھتری، برہمن، ویش اور شودر کی تقسیم اگرچہ عملی طور پر مکمل نہیں ہوی تھی اور نہ ان چاروں گروھوں کا مرتبہ اتنی پختگی سے معین ہو سکا تھا، جیسا کہ چند صدی بعد نظر آتا ہے، تاہم یہ امتیازی نام قدیم سے قدیم ہندوستانی کتابوں میں موجود ہے، اور سب سے زیادہ قابل ذکر بات یہ ہے کہ دورِ قدیم میں اس تقسیم کی بنیاد رنگ اور نسب پر تھی یعنی جو لوگ زیادہ گورے اور صاف رنگ کے تھے، نیز جن کا سات پشت تک نسب معلوم اور بے داغ ہوتا تھا، وہ سب سے شریف اور اعلیٰ ذات کے لوگ مانے جاتے تھے۔ اور دوسرا درجہ اس برہمن یا پُجاری کا تھا جس کے خاندان میں پوجا پاٹ کا پیشہ موروثی ہوئے دوسرے لفظوں میں، چھٹی صدی تک برہمنوں کو اولیت کا مرتبہ حاصل نہ ہوا تھا اور سب سے اعلیٰ ذات چھتریوں کی تھی جس کے یہی معنی ہیں کہ ابھی تک آریوں میں جنگ و جدال اور انتظامی قابلیت کی قدر و قیمت زیادہ تھی اور مذہبی پیشواؤں کا تسلّط پوری طرح قائم نہیں

ہوا تھا، بلکہ جیسا کہ بعد کی شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے۔ خود ریاضت و خدا طلبی اور ذہانت و فکر حکیمانہ میں بھی برہمن اُن سے افضل نہ تھے ؎

متوسط اور ادنیٰ ذاتیں

چھتری اور برہمنوں کے بعد تاجر، اور آزاد کسانوں کا گروہ، یعنی آبادی کا متوسط طبقہ "ویش" کہلاتا تھا اور اہلِ حرفہ یا مزدوری کرنے والے "شودروں" کے آخری گروہ میں داخل تھے جو بالعموم کالے رنگ کے غیر آریا لوگ تھے؛ پروفیسر رہس ڈیوڈ لکھتے ہیں[1] کہ ان چار ذاتوں کے نیچے بھی چند اور ذاتیں تھیں اور ٹوکری بُننے، چڑیمار، نائی، کمھار، جلاہے چمار وغیرہ ادنیٰ پیشہ وروں کا شمار ان میں ہوتا تھا اور ذلیل اور قابل نفرت ہونے کے لحاظ سے سب سے آخری درجہ چنڈال اور پکس کا تھا جو ہند کے قدیم اور اصلی باشندے تھے؛ مگر اس اعتبار سے کہ یہ "شودر" اور "چنڈال" بھی آزاد تھے، آبادی کا سب سے پست اور بدنصیب گروہ ان غلاموں کو کہنا چاہیئے جو کسی جنگ یا تاخت میں گرفتار ہوئے یا کسی جرم کی سزا میں اُن کی آزادی چھین لی گئی۔ ان غلاموں کی اولاد بھی غلام ہوتی تھی اور وہ اپنے آقا کی مِلک ہوتی

---

[1] بدھسٹ انڈیا، صفحہ ۵۴۔ لیکن اس رائے کے تسلیم کرنے میں تامل ہوتا ہے کہ کہ مبادا فاضل پروفیسر کو "ہین جات" کے لفظ نے مغالطے میں ڈالا ہو جو اب بھی بعض ادنیٰ پیشہ وروں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ مگر یہ ضرور نہیں کہ انھیں "شودروں" سے کم رتبہ سمجھا جائے؛ ۱۲

جاتے تھے۔ لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ ممالک ایشیا میں غلاموں پر وہ جور و ظلم کسی قوم نے جایز نہیں رکھے جو یونان یا روم کی قدیم تاریخ میں ہماری نظر سے گزرتے ہیں۔ نرمی کی وجہ اہل ایشیا کی ثروت و استغنا ہو یا غلاموں کی بہتات، اس میں کچھ شک نہیں کہ ان ملکوں میں غلاموں کے ساتھ معمولی نوکروں کا سا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ دوسرے جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس وقت ہندوستان میں غلاموں کی تعداد بھی غالباً بہت کم تھی ؛

باب سوم

پہلی فصل - مذہبی معتقدات

بودھ مت کی قدیم کتاب "دیگھ" نامی میں ایک نظم محفوظ ہے جس میں شاعر گوتم بودھ کی مدح و ثنا کرتا ہے اور اسی ضمن میں ہندوستان کے اُن دیوی دیوتاؤں کو گنواتا ہے جو اُس کے ممدوح کے سامنے سرِ عقیدت خم کرنے حاضر ہوئے۔ مؤرخ کی نگاہ میں ارادت مند شاعر کی یہ فہرست بہت کار آمد ہے کیونکہ اس سے یہ سراغ چل سکتا ہے کہ اس وقت (پانچویں صدی ق م) ہندوستان میں کن کن دیوی دیوتاؤں کی پرستش ہوتی تھی :-

قدیم معبود

اس فہرست میں سب سے اوّل دھرتی ماتا اور پہاڑوں کی دیویاں آتی ہیں اور اس کے بعد چار سمتوں کے چار بادشاہ (یا دیوتا) پھر گندھرو یعنی آسمانی مطرب پھر ناگ دیوتا، جن کی بہت سی قسمیں تھیں۔ پھر گرول دیوتا یعنی انسان چہرہ پرند جو ناگوں کے دشمن مانے جاتے تھے۔ پھر عفریتوں کا ایک گروہ، جن کی پوجا ہوتی تھی اور چاند سورج، آندھی، بادل، روشنی، گرمی کی دیویاں وغیرہا۔

اور آخر میں اُن دیوتاؤں کا نام ہے جو بہت سی صفات سے مُتصِف مانے جاتے تھے جیسے برہما، پرِست وغیرہ

اس طویل فہرست میں "روکھ دیوتاؤں" کا نام نہیں آیا۔ لیکن دیگر ذرائع سے یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ چھٹی (اور نیز پانچویں) صدی ق م میں بہت سے درختوں کی پوجا ہوتی تھی اور ان کی نشو ونما اور ہریاول کا سبب ہی ان کے اندر کسی روح یا ماتا کو مانا جاتا تھا، جس کے چولا بدلتے ہی درخت کی عمر بھی تمام ہو جاتی اور وہ سوکھ کر گر پڑتا تھا۔ اس فرو گزاشت سے قطع نظر، خاص طور پر قابلِ غور یہ امر ہے کہ اس فہرست میں "رِگ وید" کے سب سے قدیم اور بڑے دیوتاؤں (یعنی اِندر، اگنی، وایو اور ورن) کا کچھ ذکر نہیں حالانکہ بہت سے ایسے معبودوں کا نام ملتا ہے جن کا ویدوں میں نام تک نہیں آیا۔ ان دونوں باتوں سے یہ نتیجہ (جس کی اور طرح بھی تصدیق ہوتی ہے) نکالنا کچھ دشوار نہ ہوگا کہ ہندوستان کے باشندوں میں ابھی تک بڑا گروہ آریوں کے خاص خاص دیوتاؤں کو نہیں مانتا تھا بلکہ ایسے معبودوں کی پوجا کرتا تھا جن سے خالص آریا اوّل اوّل واقف نہ تھے۔

آریوں کے عقائد

مذہب کی اس دو رنگی کا بڑا سبب یہ ہوا کہ ہندوستان کے آریا فاتح خاص یہاں کے باشندے نہ تھے بلکہ غالباً

دوسرے ہزار ق م کے دور میں باہر سے آئے اور اپنے مذہب کے بنیادی عقائد اپنے ساتھ لائے تھے۔ چنانچہ رگ وید کے سب سے پرانے بھجن جن دیوتاؤں کی مدح و ثنا کرتے ہیں اُن کا قدیم ایرانیوں کی مذہبی کتاب اَوِستا میں بھی ذِکر موجود ہے؛ لیکن ہندوستان میں آنے کے بعد اُن عقائد میں بہت کچھ تغیّر ہوگیا تھا۔ خاص جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں، اس وقت بہ ظاہر ان کے رِشی یا اہلِ فکر مسئلہ "وحدت فی الکثرت" کی منزل تک پہنچ چکے تھے جس کا خود رگ وید کے آخری زمانے کے بھجنوں نے کم سے کم راستہ دکھا دیا تھا؛ لیکن رگ وید یا اس کے وہ تفسیری اُپنِشد جو بودھ مت کے آغاز سے پہلے کے ہیں، مذکورۂ بالا مسئلہ کا حل اس طرح کرتے ہیں کہ اگنی کو جو حرارت و نور و رطوبت کا مبدأ ہے، تمام دیوتاؤں کا دیوتا بتاتے ہیں[1] اور سب دیوتاؤں میں اسی کا جلوہ دکھاتے ہیں۔ کائنات کی ہر شے میں ظاہر یا باطن وہ موجود ہے اور تمام حرکت و حیات اسی سے ہے؛ بایں ہمہ یہ باتیں کچھ ایسے شاعرانہ پیرائے میں کہی گئی ہیں کہ غالباً رگ وید کے ماننے والوں نے کبھی اگنی کو

---

[1] چنانچہ ایک بھجن کا خاتمہ ان الفاظ پر ہوتا ہے کہ "سب دیوتا اگنی ہے!" مفصل بحث کے لئے ملاحظہ ہو "ویدک انڈیا" کا آخری باب ۱۲

"خدائے واحد" نہیں سمجھا اور نہ اُس کی اُن صفات کی پوری طرح صراحت ہوئی جن سے اس کی "ربوبیت" کا مفہوم صاف ہو جاتا، اور نہ دوسرے دیوتاؤں کے، اپنی اپنی جگہ پر، اختیارِ مطلق میں کوئی کمی آئی کہ لوگ ان کی پرستش چھوڑ کر ایک خالقِ کُل یا فاعل حقیقی سے لَو لگاتے؛ ممکن ہے کہ اس نارسائی کا سبب عقولِ انسانی کی خامی ہو۔ ممکن ہے کہ خود وید کی مجموعی تعلیم ہی شرک فی العبادت یا ارباب پرستی (Polytheism) کی تقویت کا باعث ہوئی ہو۔کیونکہ اس میں کچھ کلام نہیں کہ رگ وید میں زیرِ بحث قسم کی توحید بھی نہ تو ہر جگہ ہے اور نہ اسے صفائی کے ساتھ زور دے کے بیان کیا گیا ہے۔

قربانی اور ریاضت

بہر حال، یہ دو سبب ہوں یا ان کے سوا اور، ہمارے زیرِ نظر عہد میں اہلِ ہند متعدد خُدا مانتے تھے اور ان کی پرستش کے واسطے مندر نہیں تھے، نہ غالباً ابھی بت تراشی کا آغاز ہوا تھا، بلکہ کھیت یا باغ میں وقت کے وقت "قربان گاہ" بنالی جاتی تھی اور مالک زمین یا صاحب خانہ کی طرف سے پروہت دیوتا کے نام پر جانوروں کی بھینٹ دیتا اور دعائے خیر مانگتا تھا۔اس بھینٹ کا فائدہ (یا ثواب) ان کے عقیدے میں صرف مالک زمین کو پہنچتا تھا اور دیگر مصارفِ قربانی کے علاوہ اسے پروہتوں کو بہت معقول معاوضہ دینا پڑتا تھا۔قرینہ کہتا ہے کہ اوّل اوّل اسی شرط اور برہمنوں کی

زیادہ طلبی نے لوگوں کو، قربانی کی رسم سے بد دل کیا اور عجب نہیں کہ تہیدستی کی وجہ سے وہ برہمنوں کی شرائط نہ پوری کر سکے ہوں تو حصولِ مراد یا کفارۂ گناہ کے لئے اپنے کسی معبود کے پیکر خیالی کے روبرو گڑگڑاے ہوں اور تنہائی میں رو رو کر دعائیں کرنے لگے ہوں! قربانی سے محروم، شکستہ دل اہلِ طلب کی یہی خلوت گزینی، بہ ظاہر عبادت کے دو قدیم طریقوں کی تمہید تھی یعنی اسی شے نے ایک طرف جذبۂ بُت تراشی کی پرورش کی اور دوسری طرف ریاضتِ شاقہ میں اطمینانِ نفس کا سامان پیدا کر دیا۔ تو پہلا موضوع خارج از بحث ہے، کیونکہ یہاں ہمیں صرف اس دلچسپ واقعے پر توجّہ دلانا منظور ہے کہ رفتہ رفتہ بھینٹ اور بھینٹ چڑھانے والے تپسیا (ریاضت) سے مغلوب ہو گئے اور خود برہمنا کے مصنّف پکار اُٹھے کہ "آسمان ہوا پر، ہوا زمین پر، زمین سمندروں پر قائم ہے، اور پانی کا قیام صداقت پر ہے، صداقت کا (قربانی کے) منتروں پر اور خود منتروں کی بنیاد تپس پر ہے"! (چھٹی برہمنا ۱/۱۱)

واضح رہے کہ وید کی وہ شرحیں جو برہمنا کے نام سے موسوم ہیں، خود برہمنوں ہی کی تصنیف سے ہیں اور ان میں قربانی کی رسموں اور منتروں کا ذکر ہے، جو گویا ویدی دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لئے پڑھے جاتے تھے۔ اور جب انہی میں تپس یا تپسیا کی فوقیت مان لی گئی ہو تو پھر خیال

ہوتا ہے کہ بھیٹ کا حامی کوئی نہ رہا ہوگا۔ اس میں تو شک نہیں کہ ادنےٰ اور اعلیٰ ہر قسم کے آریوں کا ایک گروہ ایسا پیدا ہو گیا تھا جس کی نگاہ میں بھیٹ پوجا کی کوئی وقعت نہ رہی تھی اور اس گروہ کے افراد ذہانت اور اخلاق میں برہمنوں پر ایسی نمایاں برتری رکھتے تھے کہ نہ صرف عوام الناس بلکہ خود برہمنوں کو یہ فوقیت تسلیم کرنی پڑتی تھی حتیٰ کہ بعض برہمن خود بھی انہی تپسویوں کے کلّی یا جزوی طور پر ہم خیال ہو جاتے تھے۔ اور اسی قسم کے برہمنوں نے تپس کی وہ بڑائیاں کی ہیں جن کا ایک نمونہ اوپر نقل ہوا۔ بایں ہمہ سارے برہمنوں کی یہ رائے نہ تھی۔ تپس کی وجہ سے اپنی کساد بازاری اور لوگوں میں تپسویوں کی عزت دیکھ کر وہ حسد کرتے تھے مگر ان کا کچھ زور نہ چلتا تھا اور انہوں نے اپنی اور قربانی کی رسموں کی عظمت بحال کرنے کے لئے جو کچھ ہاتھ پاؤں مارے، اس میں بھی چنداں کامیابی نہیں ہوی۔ تاہم اسی جد و جہد نے اُپنِ شَد کا ایک بڑا "فلسفۂ روحانیات" تیار کر دیا۔

آتمان و پرماتمان

یہ روح کا مسئلہ ہے جس پر غور و خوض کرنے کا یہ بھی ایک سبب ہُوا کہ برہمن اپنے پُر اسرار منتروں کے باطنی اثرات سمجھنا اور سمجھانا چاہتے تھے تاکہ اہل ریاضت کے مقابلے میں ان کو شکست فاش نصیب نہ ہو۔ انہوں نے اس بارے مین بیان کے نہایت دقیق پیرائے اختیار

کئے ہیں اور اس میں جا بہ جا تضاد و تخالف بھی پایا جاتا ہے[1]۔ مگر سادہ لفظوں میں ان کے اس عقیدے کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر جسم کی حرکت و حیات کا باعث روح ہے جسے وہ کبھی اُون سے تشبیہہ دیتے ہیں۔ کبھی بجلی کی چمک سے اور کبھی "نورِ بے دود" سے۔ اگرچہ اس کے اجزائے ترکیبی میں غیر مادّی صفات و خواص کے ساتھ ہم مادّی عناصر (خاک و آب) کے نام بھی پاتے ہیں؛ بہر حال وہ جس سے بھی بنی تھی اس کے متعلق دو باتیں قابل لحاظ ہیں:- اوّل تو یہ کہ بعض مقامات پر اپن شدون میں یہ بات نہایت صفائی اور وضاحت سے بیان کی گئی ہے، کہ جذبات و شعور روح کی خصوصیات میں ہیں اور جب (حالتِ خواب یا موت کے وقت) روح نکل جاتی ہے تو جسم انسانی ان دونوں سے محروم ہو جاتا ہے؛ لیکن دوسرا اور زیادہ اہم عقیدہ، جس سے اپن شدوں میں کہیں بھی اختلاف نہیں کیا گیا، یہ ہے کہ رُوح کو "آواگون" سے نہ تپسیا نجات دلا سکتی ہے نہ بھینٹ بلکہ یہ مرتبہ اُسے صرف اس وقت حاصل ہوگا جب کہ وہ اپنی رُوح کو اُس "روح اعظم" کا جزو لاینفک محسوس کرنے لگے، جو تمام کائنات کی جان یعنی سب سے اعلیٰ روح یا **پرماتماں** ہے۔ ازل سے تھی اور ابد تک قائم رہے گی۔

---

[1] برھسٹ انڈیا صفحہ ۲۵۲ و ۲۵۳۔

*

یاد رکھنا چاہیئے کہ اوّل ہی اول "آتماں" یا انسانی روح کا خیال پیدا ہوا تھا۔اور جہاں تک تحقیقاتِ جدید کا دخل ہے یہی ثابت ہوتا ہے کہ "پرماتماں" کے عقیدے نے بعد میں تکمیل پائی جیساکہ خود اس لفظ سے ثابت ہے (پرم = اعلیٰ + آتمان = روح) لیکن اس دقیق و ہمہ گیر عقیدے تک پہنچنے کے بعد یہ قدرتی بات تھی کہ اس "روحِ کائنات" اور اُن ہستیوں میں قریبی تعلق مانا جائے جو ذی روح (یعنی صاحب ارادہ) تسلیم کی جاتی تھیں۔چنانچہ تمام دیوتا اور انسانوں کی روح کا مبداء اسی ہستیٔ کُبریٰ کو ماننے لگے خاص کر انسان کی روح کے متعلق یہ اعتقاد جم گیا کہ جسم خاکی میں وہی پرماتماں جلوہ گر ہے جس کی بہ دولت انسان، انسان بنا ہے۔

مگر اس عظیم الشان تخیّل کے اپن شدوں میں موجود ہونے سے یہ قیاس نہ کرنا چاہیئے کہ یہ فلسفہ برہمن یا پروہتوں کی سعیٔ فکر کا نتیجہ ہے۔ اس کے برعکس، ہمارے پاس بہت سی شہادتیں موجود ہیں کہ گو برہمنوں نے "پرماتماں" کے عقیدے کو بودھ مت کے آغاز سے پہلے اپنے مذہب میں داخل کرلیا تھا، بایں ہمہ وہ یا ان کے مقلّد اس کے بانی نہ تھے بلکہ یہ دوسرے اہلِ فکر کا کام تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جب خود اس (پرماتماں کے) عقیدے پر گفتگو شروع ہوی تو برہمن اپنے مذہب کی کچھ اچھی وکالت نہ کرسکے اور دوسرے فلسفیوں نے اس عقیدے میں طرح طرح کے شاخسانے نکالے بلکہ آخر میں ایک گروہ (یعنی بودھ مت والوں) نے "روح" کا وجود ہی ماننے سے انکار کردیا ہے۔

دُوسری فصل - جین مت

مختلف مذاہب

عالمِ افکار میں جس تلاطُم کا ہم نے پہلی فصل میں اشارہ کیا ہے اس کا آغاز ان جنگلوں میں ہوا جہاں حکیمانہ دماغ کے لوگ، دنیا اور اہل دنیا سے الگ ہو کر "رازِ دہر" کی جستجو میں منہمک تھے۔ اس قسم کے راہبوں کا ہندوؤں کی قدیم سے قدیم کتاب میں ذکر موجود ہے۔ کم سے کم پیشِ نظر زمانے میں رہبانیت ایک معروف طرز زندگی بن گئی تھی۔ آبادیوں سے کچھ ہٹ کر جا بہ جا صحرا نشین راہبوں کے مسکن ہوتے جن میں کہیں استغراق و محویت اور کہیں خوف انگیز ریاضتوں کے منظر دکھائی دیتے تھے؛ لیکن بہت سے راہب، ترک دنیا کے با وجود باقاعدہ تعلیم کا مشغلہ کرتے تھے اور حکمت و علومِ الٰہیہ کے سیکھنے والوں کا ان کے ہاں مجمع رہتا تھا۔ بے شبہ اوّل اوّل اس درس و تدریس کا منشا وید کو حفظ کرانے کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔ لیکن رفتہ رفتہ درس کا میدان وسیع ہوا تو بحث و موشگافی کے ہزاروں پہلو نکل آئے اور اب استادوں کا صرف یہی کام نہ رہا کہ وید کے بھجن سنادیں اور شاگردوں کو اچھی طرح یاد کرا دیں، بلکہ انسان، خدا، اور آفرینش کے اہم مسائل پر بھی وہ بڑی بڑی تقریریں کرنے لگے اور اسی منزل میں پہنچ کر اُن میں لازمی طور پر بہت سے اختلافات

پیدا ہو گئے۔ چنانچہ جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں، اس میں ایسے کئی گروہ یا مذاہب کا پتہ چلتا ہے جس کے پیرو معاش و معاد کے متعلق بالکل جداگانہ رائے رکھتے تھے۔ ان کے باہمی مناظروں کی بھی بعض روایتیں محفوظ ہیں اور معلوم ہوتا ہے انہی نئے نئے خیالات کو پھیلانے کے جوش میں بہت سے راہبوں نے اپنی زاویہ نشینی چھوڑ کر سیاحت و جہاں گردی اختیار کر لی تھی اور انہیں "پرباجکا" کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ چونکہ یہ لوگ عام طور پر آزاد خیال اور برہمنوں کی نظر میں مُلحد ہوتے تھے اس لئے "پرباجکا" میں تارک الدنیا جہاں گرد ہونے کے ساتھ مُلحد ہونے کا مفہوم بھی شامل ہو گیا تھا۔[1]

اس کتاب میں ان سب گروہوں کے حالات و عقائد کا پتہ لگانا، بے محل طوالت کا موجب ہوگا کیونکہ ان میں سے اکثر کا صرف نام ہی نام بعض پرانی کتابوں میں باقی رہ گیا ہے۔ البتہ اس جگہ ان دو مذہبوں کا ذکر کرنا ضروری ہے جنھوں نے قدیم ہندوؤں کے تمدّن و افکار پر اثر ڈالا اور جن کے

[1] چونکہ یہ نئے گروہ زیادہ تر مگدھ یا اس کے شمال مغرب ہمسایہ علاقوں میں پیدا ہوئے تھے، جہاں کی آبادی خالص آریہ نسل کی نہ تھی لہذا ونسنٹ اسمتھ کی یہ رائے بھی قابل لحاظ ہے کہ یہاں کے اعلیٰ طبقے میں غیر قوم کے برہمن وہ مذہبی اقتدار نہ پا سکے جو انہیں اپنے ہم قوم آریوں میں حاصل تھا پس اُن کی دینی تعلیم اور عقائد سے یہاں کے آزاد خیال اُمراء (یا چھتریوں) نے انحراف کیا اور یہ دعویٰ نہ مانا کہ ان اجنبی برہمنوں کے سوا کوئی علم و حکمت سے آشنا نہیں ہو سکتا نہ نجات حاصل کر سکتا ہے۔ (اوکسفورڈ ہسٹری مطبوعہ ۱۹۱۹ء صفحہ ۴۹)

نام لیوا اب تک ہند یا بیرون ہند میں موجود ہیں۔

ان دونوں میں تقدم جین مت کو حاصل ہے جس کا بانی وردھ مان مہابیر جناتری پتر (Vardhamana mahvira Jnatriputra) ہوا ہے۔ وردھ مان مہابیر کا مذہب

اس نامور ہندی کے ذاتی حالات کو قدامت نے اس قدر دھندھلا کر دیا ہے کہ افسانہ وقصص کے انبار میں کوئی بات قابل اعتبار ملتی ہے تو وہ یہ کہ مہابیر ویسالی کا چھتری امیر زادہ تھا اور چھٹی صدی (ق م) کے آخر یا پانچویں صدی کے شروع میں اس نے مگدھ دیس ہی میں وفات پائی۔ بالفاظ دیگر وہ راجہ بمبسار اور اپنے نامی ترحریف گوتم بودھ کا نہ صرف ہمعصر گزرا ہے بلکہ اس کی زندگی بھی زیادہ تر اسی علاقے میں بسر ہوی جو گوتم کا مولد و منشا تھا۔ اصول و عقائد

لیکن مہابیر نے جو تعلیم دی وہ نہ صرف مختلف بلکہ ایک حد تک بودھ مت کی ضد ہے، اور اس کے مذہب کا بنیادی اصول ہی یہ تھا کہ ہر ذی حیات و غیر ذی حیات حتیٰ کہ باد و آتش میں بھی روح ہے (حالانکہ بودھ مت والے روح سے مطلق سروکار نہیں رکھتے) البتہ تپسیا کا وہ بھی ایسا ہی معتقد تھا جیسا کہ اس کے دوسرے معاصرین چنانچہ اس کا یہ قول مشہور ہے کہ "جسم کو مغلوب کر، اپنے نفس کو مار اور اپنے آپ کو اس طرح بے دم کر دے جس طرح آگ سوکھی لکڑی کو جلا کے کر دیتی ہے۔"

اسی ضمن میں کسی "جیو" کو تکلیف پہنچانے کی سخت ممانعت کی گئی ہے اور چونکہ "جیو" (یعنی روح) سے جینیوں کے عقیدے میں کوئی چیز خالی نہیں لہذا اچھا جینی وہی شخص بن سکتا تھا جو نہ صرف فاقہ کشی اختیار کرے بلکہ "جان آزاری" کے خوف سے دانت تک نہ مانجھے اور کپڑا بھی نہ دھوئے بلکہ ممکن ہو تو بالکل استعمال ہی نہ کرے؛ چنانچہ اس مذہب کے معتقد اسی بنا پر "دِگمبر" کہلاتے تھے کہ ان کے جسم پر کوئی کپڑا نہ ہوتا تھا اور مگاس تھنیز یونانی نے بھی انہیں "جمنوسوفسٹ" (یعنی حکمائے عریاں) کا خطاب دیا ہے جو بعد کے یونانی مصنّفین کے ہاں محفوظ رہا؛ لیکن عقائد کے اعتبار سے جینیوں کا سب سے عجیب مسئلہ "سیادواد" کا اصول ہے جس کی رُو سے ہم ایک ہی وقت میں جس بات کا چاہیں اقرار و انکار دونوں کر سکتے ہیں اور اس سے ہمارے مذہبی معتقدات میں کوئی خلل نہیں آتا اور نہ عقل کا قصور ثابت ہوتا ہے! مثلاً ہم عالَم کے حدوث اور قِدَم دونوں کے قائل ہو سکتے ہیں اور اس کی تاویل یوں ہو جائے گی کہ "عالَم ایک طرح سے قدیم ہے اور ایک طرح سے دیکھیے تو حادث ہے!"

ظاہر ہے کہ اس قسم کے مبہم عقائد اور سخت قیود عام طور پر قبولیت نہیں پا سکتے اور یہی سبب ہے کہ ہندوستان میں جین مت کو زیادہ فروغ کبھی حاصل نہیں ہُوا۔ اور کچھ عرصے بعد

اس کے عملی اصول میں بھی ترمیم کرنی پڑی۔ چنانچہ گو جینیوں کے مندروں میں آج تک بتوں کو بالکل برہنہ بناتے ہیں لیکن ایسے عقیدت مندوں کی تعداد بہت کم ہوگی جو خود اسی شعار پر قائم ہوں اور جنھوں نے دینوی لذات کے ساتھ لباس بھی ترک کر دیا ہو۔

تیسری فصل[۱]۔ ساکی منی گوتم اور بودھ مت

ذاتی حالات

جیساکہ نام کے پہلے ٹکڑے سے ظاہر ہے گوتم بودھ قبیلہ ساکی یا ساکیا کا فرد تھا اور یہ وِجئین قوم کا وہ قبیلہ ہے جس کے دائرہ حکومت میں موجودہ ریاست نیپال اور کسی قدر جنوب کا علاقہ شامل ہوگا۔ ان دنوں اس قبیلے کا صدر مقام کپل وست (Kapilavastu) موجودہ ضلع بستی کے شمال میں (عرض بلد شمالی ۲۷° ۳۷َ کے قریب) واقع تھا اور اس میں جمہوری طرز کی "حکومت شرفا" قائم تھی۔ سدھودن کو شرفا کے اسی حکمران طبقے کا ایک رئیس بتایا گیا ہے

---

[۱] اس فصل کے لکھنے میں خاص طور پر ان کتابوں سے مدد لی گئی ہے:۔

(۱) "بدھسٹ انڈیا" (۲) "مینوول آوف بدھزم" (از کرن) (۳) ارلی ہسٹری آوف انڈیا"

(۴) "بُدھا" اور "بُدھزم" جلد چہارم انسائیکلوپیڈیا طبع نو

جس کے دو بیویاں تھیں اور اولاد نہ ہوتی تھی۔ آخر عمر کے پینتالیسویں برس اس کی بڑی بیوی مہامایا کو حمل رہا اور وہ اپنے میکے روانہ ہو گئی کہ وضع حمل تک وہیں رہے۔ لیکن میکے پہنچنے سے پہلے راستے میں وضع حمل ہوا اور آئندہ بودھ نے سب سے پہلے سورج کی روشنی لمبنی کے باغ میں دیکھی جو ریاست نیپال کی موجودہ حدود کے اندر شاید تلار ندی کے کنارے واقع تھا۔ یہ باغ جس شہر سے تعلق رکھتا تھا اس کے کھنڈر بھی حال میں دریافت ہوئے ہیں اور یہیں سے اشوک راجہ کا وہ مشہور کتبہ برآمد ہوا ہے جس سے گوتم بودھ کی ولادت کا ٹھیک ٹھیک مقام معلوم ہوا ہے لیکن افسوس ہے کہ اس کتبے سے بھی سنِ ولادت کا تعیّن نہیں ہوتا۔ لنکا کی مذہبی کتابوں سے اس قدر تو سراغ ملتا ہے کہ گوتم اشوک راجہ کی تخت نشینی سے دو سو اٹھارہ برس پہلے پیدا ہوا تھا۔ لیکن خود اس تخت نشینی کا سن یقینی طور پر معلوم نہیں۔ کیونکہ مذکورۂ بالا ماخذ کی رو سے اشوک ۳۰۵ ق م میں تخت پر بیٹھا۔ حالانکہ یورپ کے جدید محقق اس کو ۳۵۰ یا ۳۵۵ کا واقعہ سمجھتے ہیں اور اسی بنا پر ان کے نزدیک گوتم کی پیدائش ۵۶۸ ق م میں ہوئی۔ چونکہ اس کی عمر کے متعلق یہ امر عام طور پر مسلّم ہے کہ وہ اسی سال تک زندہ رہا۔ لہٰذا مذکورۂ بالا سنہ ولادت کو درست مان لیا جائے تو اس کی وفات ۴۸۸ ق م کا واقعہ ہوگی اور متعدّد قرائن سے

یہی دونوں سن قریب قریب صحیح ثابت ہوئے ہیں ؛

ترکِ دنیا

بہر حال، اس قدر یقینی ہے کہ اپنی نوجوانی امیرانہ عیش و نشاط میں صرف کرنے کے بعد انتیس[۲۹] برس کی عمر میں اُس نے ترکِ دنیا کا ارادہ کیا اور عین اُس روز جب کہ اس کے ہاں بچہ پیدا ہونے کی خوشی میں رقص و سرود کے جلسے ہو رہے تھے رات کے وقت گھر سے نکل گیا۔ دنیا کی ثروت و جاہ کو لات ماری اور جنگل میں ایک فاقہ کش فقیر کی طرح رہنے لگا۔ اس حال میں اس نے شدید مصائب برداشت کئے اور عرصے تک سخت ریاضتیں کرتا رہا لیکن وہ اطمینانِ نفس جس کی خاطر یہ سب دُکھ جھیلے تھے، میسر نہ آیا۔ آخر ایک روز جب کہ وہ نرن جرا ندی کے کنارے ایک بڑ کے سائے میں بیٹھا ہوا یہی سوچ بچار کر رہا تھا اور مختلف خیالات کی کشمکش سوہانِ روح ہوی جاتی تھی، ناگہاں اسے اپنے خیال میں عرفانِ حقیقی کی تجلّی نظر آگئی اور کئی دن کے بعد جب وہ اس درخت سے اٹھا تو عارف کامل (بُدھا یا بودھ) بن کے اٹھا اور دنیا کو وہ تعلیم دینی شروع کی جو "بودھ مت" کے نام سے مشہور ہے ؛

غایت اور اصول مذہب

بودھ نے اپنے مذہب کی غایت یہ رکھی ہے کہ انسان اسی دنیا کی زندگی میں "نروان[۱]" کو حاصل کرلے اور نروان نفس کی اس حالت مطمئنہ کا نام ہے جس میں دُنیوی افکار و آلام کا

---

[۱] ہندؤوں کے ہاں "جیون مکتی" (یعنی نجاتِ روح) اس لفظ کا مرادف ہے ؛ دیکھو کرن کی کتاب صفحہ ۵۰ وغیرہ ۱۲

دل پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔یہی وہ شے ہے جسے حاصل کرنے کے بعد آدمی بودھ مت کی اصطلاح میں "ارہٹ" کے مرتبے پر فائز ہوتا ہے۔یعنی اب وہ اخلاقی برائیوں کے جراثیم سے پاک ہے، اس کی ناپاکیاں دُھل گئیں، اس نے اپنا کام پورا کر لیا، اپنا بوجھ اتار دیا، بند جُدا کر دیئے اور آواگون کے چکر سے نجات حاصل کر لی!

اس "غائت" کو پڑھ کر یہ سمجھنا دشوار نہ ہوگا کہ بودھ نے جس "حقیقت" کی بنیاد پر اپنی عظیم الشان عمارت چُنی، وہ یہ عقیدہ تھا کہ "طبعاً انسان رنج و مصائب کا ہدف ہے" جس وقت وہ ایک علیحدہ فرد بنا، اسی وقت سے وہ ایک "محدود ہستی" ہوگیا اور اس کے محدود ہونے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اس کا علم محدود اور "جہل" کا سبب ہو۔جہل رنج و الم کا اصلی مبدء ہے لہٰذا (محدود ہستی کی شکل میں) انسان کی "تکوین" ہی اس کے مصائب کی بِنا ہے اور ان سے نجات صرف اسی صورت میں مل سکتی ہے جب کہ انسان "طریق وسطیٰ" یعنی بیچ کے راستے پر چل کر حقیقی عرفان حاصل کرلے۔

بیچ کا راستہ

گوتم کی تعلیم کے بہ موجب "بیچ کا راستہ" اختیار کرنے کے معنی یہ ہیں کہ انسان خیالات و خواہش، گفتار و کردار، کوشش و بسر اوقات اور ہوش و محویت، گویا آٹھ حالتوں میں، راستی کا پابند ہو۔ان میں سے ہر حالت کے متعلق بودھ مت کی کتابوں میں صراحت و بحث کی گئی ہے اور بالکل شروع ہی میں (یعنے

خیالاتِ راست کی تصریح کے ضمن میں) روح کے علیحدہ وجود سے انکار کیا ہے۔ اور آواگون کی بھی بالکل دوسری صورت بیان کی ہے۔ یعنی ایک جسم سے دوسرے جسم میں کوئی "روح" منتقل نہیں ہوتی بلکہ ایک جنم کی بُری یا بھلی صفات اور افعال کا اثر منتقل ہو جاتا ہے اور دوسرے جنم میں اِنسان اپنے پہلے جنم کے کرم کا پھل پاتا ہے؛ گویا سچ پوچھئے تو ہندوؤں کے کرم کا مسئلہ گوتم نے "تناسخ صفات" کی صورت میں تسلیم کر لیا تھا؛ اور اس نے روح کو جسم سے علٰحدہ کوئی وجود یا ہستی نہیں مانا تو اس کی بڑی وجہ یہ قرار دی جا سکتی ہے کہ روح کے متعلق قدیم ہندوؤں میں بہت انوکھے اور عجیب عجیب عقائد پیدا ہو گئے تھے۔ بایں ہمہ خود بودھ مت کا "تناسخ" بھی کسی ایسی عقلی دلیل پر مبنی نہیں ہے جسے بلا دقّت تسلیم کر لیا جائے؟[1]

خدا سے بے تعلقی؟ اسی سلسلے میں جب روح کے علٰحدہ وجود سے گوتم نے انکار کیا تو اس روحِ اعلیٰ کو بھی اس کے مذہب میں کوئی ممتاز جگہ نہ ملی جس تک ہندو رشیوں کی فکرِ حکیمانہ (غالباً گوتم کے عہد سے بہت پہلے) پہنچ چکی تھی۔ حالانکہ اس مذہب میں بہت سے دیوتاؤں کو مانا گیا ہے جن کے مختلف عالَم اور طبقے قرار دئیے ہیں۔ اور خود بانیٔ مذہب کو جن قواء سے متصف مانا ہے۔

[1] اس بارے میں کہ بودھ مت نے خود کبھی معقولی مذہب ہونے کا دعویٰ نہیں کیا، دیکھو کرن کی "مینوئل آوف انڈین بدھزم" صفحہ ۴۹ و ۵۰ ۱۲

وہ بھی اگر خدا نہیں تو مافوق الانسان ضرور ہیں۔ بہر حال بودھ مت کی یہی وہ عجیب خصوصیت ہے جس کی بنا پر بعض مغربی مصنّف گوتم کو دنیا کا سب سے "بلند خیال" فلسفی ماننے کے لئے تیار ہیں، گو اس کی تعلیم بجنسہ اب موجود نہ ہو اور اس لئے حقیقی معنی میں بودھ مت کے پیرو مفقود ہوں[1] اور گو عقل، اُس کے بتائے ہوئے عقائد کو نہ مانے اور تجربہ، اس کی "شریعت" کو ناقابل عمل ٹھیرائے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ گوتم کے تخیّل نے مذہب و اخلاق کی جو حیرت انگیز عمارت تیار کی تھی وہ دنیا کے کسی دوسرے فلسفی سے کبھی نہ بن سکی اور یہی سبب ہے کہ آج اگر افلاطون و ہراکلی تس کے صرف تحریری مسائل مدرسوں میں پڑھے جاتے ہیں تو گوتم کی مورت صدہا مندروں میں عبادت کا خراج وصول کرتی ہے۔ ان بھولے پرستاروں کو عقل و ذہانت میں ہم اُن طلبہ کا ہم پلّہ نہ تسلیم کریں تو بھی یہ ماننا پڑیگا کہ دنیا کے دیگر حکما، بنی نوع کو محض اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کرتے رہے اور ہندوستان کے اس مُنی نے ہزاروں کو

[1] بودھ مت ماننے والے سب سے بڑی تعداد میں چینی کے باشندے سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن اعمال و عقائد میں ان کا یہ مذہب دوسرے ادیان خاص کر تاؤ کے ساتھ اس قدر خلط ملط ہوگیا ہے کہ انہیں گوتم کا پیرو کہنا درست نہ ہوگا۔ ملاحظہ ہو انسائی کلوپیڈیا جلد ۲ صفحہ ۱۷۵۔

عملاً اپنا پیرو بنا دیا تھا۔

علمی تعلیم

اہل مشرق کی اوہام پرستی کو بھی اس کامیابی کی ایک وجہ قرار دے سکتے ہیں۔ لیکن محض اس توجیہ پر اکتفا کرنا، گوتم کے فلسفے کی جس نے ہندوستان کے قدیم تر مذاہب کا رنگ پھیکا کر دیا، سخت ناقدری ہوگی۔ دوسرے اس عہد کے حالات کو سامنے رکھنے سے یہ بات بخوبی سمجھ میں آجاتی ہے کہ گوتم کی کامیابی کے اصلی اسباب کیا تھے؟ درحقیقت وہ قدیم عقائد میں اصلاح کرنے کا اس قدر خواہاں نہ تھا جس قدر کہ عملی طور پر اپنے بنی نوع کی زندگی سنوارنی چاہتا تھا اور اس میں اور دیگر فلاسفہ میں یہی فرق ہے۔ اگر اس نے "آتماں" سے انکار کیا یا "پراتماں" سے کوئی سروکار نہ رکھا تو اس کا باعث بھی یہ تھا کہ وہ اسی دنیاوی زندگی اور جسمانی افعال کی اہمیت پر زور دینا چاہتا تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ انسان فطرۃً بدی کی طرف مائل پیدا ہوا ہے اور بدی اس کے تمام آلام و مصائب کی جڑ ہے پس محض اپنی دنیاوی زندگی آرام و راحت سے گزارنے کے لئے انسان کا فرض ہے کہ بدی سے بچے۔ اس بدی کی اس نے انیس 19 شکلیں گنائی ہیں جن میں سے دس کو وہ "سمبوجن" (یعنی بندشیں) کہتا ہے، چار کو "اشوا" (یعنی نشئے) اور پانچ کا اصطلاحی نام "نیورن" (یعنی موانع) بتاتا ہے۔ ان سے بچنے اور آٹھ سچائیوں پر چلنے کے لئے جن کا اوپر ذکر آچکا ہے، سالک کو

کم سے کم چالیس ”کم ٹھان“ (یعنی اعمال) کی پابندی کرنی چاہیئے جن میں چند قسم کے مراقبے اور درویشانہ قسم کی زندگی گزارنے کی تعلیم ہے۔ ریاضت ہائے شاقہ اور ترکِ دنیا سے بودھ نے اپنے پیرووں کو بہ تاکید روکا ہے لیکن تزکیۂ نفس کے لئے جوگیوں کے بعض طریقے اور مراقبے اختیار کرلئے ہیں، جو پہلے سے ہندوستان میں موجود تھے۔ ان مراقبوں میں خدا سے تو نہیں لگائی جاتی بلکہ سفیدی، زردی، روشنی یا آب و خاک وغیرہ عناصر پر دھیان جماتے ہیں ان اعمال سے آدمی کو مافوق الانسان قوت حاصل ہو جاتی ہے اور اگر سب مقامات طے کرجائے تو بودھ کا دعویٰ ہے کہ پھر سالک تمام برائیوں سے پاک ہوکر ”نفس مطمئنہ“ حاصل کریگا جس کے بعد صرف ایک درجہ ”فنا“ کا اور ہے اور اس کی تکمیل موت کے بعد ہوتی ہے[1]۔

[1] کرن صفحات ۵۳ و آئندہ -۱۲
ان عبادات کو دیکھ کر قدرتی طور پر تعجب ہوتا ہے کہ ذات باری تعالیٰ کے متعلق بودھ کا وسیع نظام مذہبی کیوں ساکت ہے؟ گمان ہوتا ہے کہ شاید اس نے اس تعلیم کو محض انکشافی اور وجدانی قرار دیا ہو اور واجب الوجود کو منطقی اور علمی دلائل سے ثابت کرنے کی بجائے مراقبات کی غائت ہی یہ رکھی ہو کہ سالک اپنی ذات کو فنا کرکے اُس ذات واحد کا ادراک کرے جو نہ حواس ظاہری سے محسوس ہوسکتی ہے نہ ظاہری علم اور عقل و قیاس کی اس تک رسائی ہے۔ مگر مذکورۂ بالا رائے کا کوئی ثبوت زمانۂ جدید کے محققین کی تحریر میں نہیں ملتا اور بعض مغربی مصنف اس بات پر زور دیتے ہیں کہ گوتم بودھ کی شریعت اور طریقت میں وجود باری تعالےٰ کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ حالانکہ انہیں اسبات کا اقرار ہے کہ بودھ کی تعلیم میں بہت کچھ تحریف ہوچکی ہے اور اب اُس کی اصلیت کا ٹھیک پتہ نہیں چل سکتا۔ تو اسی ضمن میں یہ لکھنا ضروری ہے کہ ہمارے لایق ہموطن بابو منماتھ دت نے اپنی مشہور کتاب ”پرافٹس اوف انڈیا“ (حصہ اوّل) میں بودھ کے ملحد ہونے کی شد و مد سے تردید کی ہے اور لکھا ہے کہ وہ کرشن جی کی طرح پکا موحّد تھا۔

باب چہارم

پہلی فصل۔ سکندر کی فوج کشی ہندوستان پر

ہندوستان کی قدیم تاریخ کے جو ورق سادہ پڑے ہیں انہیں مذہبی مباحث سے پُر کرنے کا خیال اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ اس بارے میں ہمارے پاس کچھ نہ کچھ وسائل معلومات موجود ہیں خاص کر بودھ مت نے پجاریوں کے علی الرغم جو فروغ چھٹی اور پانچویں صدی (ق م) میں حاصل کیا، اس کے بہت سے حالات روایات و قصص کی صورت میں باقی رہ گئے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ واقعاتِ تاریخی کے جویا کی مذہب و فلسفہ کے پیچیدہ مسائل پڑھ کر تشفی نہیں ہوسکتی۔ پس مورخوں کی نظر میں سکندر یونانی کی آمد، گویا رات کی تاریکی میں کسی شمع کا روشن ہو جانا ہے جس کے اُجالے میں ہمیں نہ صرف مردانِ مقدونیہ اور شہسوارانِ تھسالیہ کی سپاہ گری، بلکہ ہندوستان کے بہت سے باشندوں کی صورتیں نظر آئیں گی۔

حملے کا سبب

اس مغربی کشور کشا کی حملہ آوری کا سبب بیان کرنے میں مغرب کے موجودہ اہل تصنیف نے بڑی بڑی موشگافیاں کی ہیں۔ کوی تو لکھتا ہے کہ وہ یونان (اور اس لئے یورپ) کی تہذیب کا شمع بردار بن کر چلا تھا اور تمام ایشیا میں اس تمدن کی روشنی

پھیلا دینی چاہتا تھا۔ کسی نے ثابت کیا ہے کہ سکندر کی ہند پر فوج کشی تجارتی اغراض پر مبنی تھی اور وہ اس ملک کا، جسے اہلِ یونان عجائبات کی سرزمین اور دولت کی کان سمجھتے تھے راستہ صاف کر دینے کا خواہاں تھا۔ لیکن وہ لوگ جو قلب انسانی کے چور پکڑ لیتے ہیں اور جنھوں نے بادشاہوں کے خوفناک جذباتِ باطنی کا مطالعہ کیا ہے، ان باتوں کو محض مؤرخانہ وکالت سمجھیں گے۔ یہ عذر تو کسی حد تک قابلِ سماعت ہو سکتا ہے کہ دولتِ ایران کا نیا وارث داریوش کے قدیم صوبے کو پھر سلطنت میں شامل کرنے کا خواہاں تھا۔ ورنہ سچ پوچھئے تو اُس گرفتار ڈاکو کے الزامی سوال کا سکندر کے پاس کوئی شافی جواب نہ نکلے گا، جس نے پہلے اپنا جرم دریافت کیا تھا اور پھر جواب میں کہا تھا کہ اگر دوسروں کا مال چھین لینا جُرم ہے تو اے بادشاہ (سکندر) تو دوسروں کے مُلک کیوں چھینتا پھرتا ہے؟ یہ روایت سچ ہو یا جھوٹ، شاید اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ سکندر کی فتوحات کے متعلق راوی کی رائے کیا تھی!

درحقیقت دولت و جاہ کی طرح مُلک گیری کی ہوس بھی کسی دلیلِ عقلی کی پابند نہیں۔ بلکہ جس طرح روپیہ کی زیادتی کے ساتھ طامع بخیل کی محبتِ مال بڑھتی ہے اسی طرح نئے مقبوضات سے فاتح بادشاہ (یا قوم) کی ہوسِ ملک ستانی بھی افزوں ہوتی جاتی ہے۔ اور ایک زمین پر قبضہ کرتے ہی وہ دُوسرا علاقہ لینے کی اُدھیڑبُن میں لگ جاتا ہے۔ نفسِ انسانی کے اس مرض کا انجام عام طور پر

ہلاکت ہوا ہے۔ جس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ جیتے جی اس عارضے سے شفا حاصل ہونی دشوار ہے۔ اور تاریخ گواہی دیتی ہے کہ جنھوں نے کشور کشائی کے میدان میں قدم رکھّا، خواہ ان کی غرض محض حصولِ شہرت و نام آوری ہو یا اپنے ہم قوموں کی نفع رسانی، وہ پھر اس وقت تک کہ حریفان قوی یا مرگ مبرم نے اُنہیں مغلوب نہ کیا، آگے بڑھنے سے نہیں رُکے۔ سکندر یونانی کو بھی اس عہد کی سب سے وسیع سلطنت مسخر کرنے کے بعد اگر تمام عالم کی بادشاہی کی اور چشمۂ حیوان، یا سورج کے دروازے" دیکھنے کی ہوس پیدا ہوگئی ہو تو یہ کچھ حیرت کی بات نہیں ہے[۱]۔

آمد کاراستہ بہر حال، یونانی فاتح کا لشکر سُغد و باختر کی تسخیر سے فراغت پاکر موجودہ افغانستان کے علاقہ میں داخل ہوا (۳۲۷ ق م) اور وہاں سے دو حصوں میں منقسم ہو کر کوہستان سلیمان کو عبور کر آیا۔ ان فوجوں نے جو راستے اختیار کئے تھے، ان کا پتہ چلانا دشوار ہے کیونکہ اوّل تو اس زمانے کی بستیاں ہی ویران وغیر آباد ہوگئیں دوسرے یونانی مصنفوں نے ان کے صحیح نام یا محل وقوع نہیں لکھے۔ اس قدر ضرور معلوم ہوتا ہے کہ جو فوج خود سکندر کے ماتحت تھی وہ چترال ندی کی وادی سے گزر کر سب سے اوّل

---

[۱] سکندر کی اِن اولوالعزمیوں کے متعلق جو روایتیں مشہور تھیں اور اب تک مشہور ہیں وہ بالکل بے بنیاد نہ تھیں۔ ملاحظہ ہو "الکزنڈرز ایمپائر" صفحہ ۳۵۔

سرحد ہندوستان کے اس علاقے میں داخل ہوی تھی جسے آج کل باجور کہتے ہیں۔ یہاں کے باشندوں سے دو سخت لڑائیاں ہوئیں، یونانیوں کو غلبہ حاصل ہوا اور وہ موجودہ سوات کی ایک پہاڑی ریاست **نیسا** میں پہنچے جس کی تسخیر کے حالات مشتبہ ہیں۔ یونانی راویوں کا بیان ہے کہ یہاں کے پائے تخت پر فوج کا حملہ کارگر نہیں ہوا تو سکندر نے شہر کی ناکہ بندی کا سامان کیا۔ لیکن خود شہر والوں نے اطاعت قبول کرلی اور یہ عجیب دعویٰ پیش کیا کہ ہم اہلِ مقدونیہ کے ہم نسل ہیں۔ سکندر نے یہ دعویٰ (جس کے ثبوت ذرا بھی قابلِ یقین نہ تھے) بلا حجت مان لیا اور ان صدیوں کے "بچھڑے ہوے عزیزوں" کی مہمانی قبول کی۔ اس زمانے کے نقّادوں کا خیال ہے کہ سکندر کا یہ فعل اس مصلحت پر مبنی تھا کہ مقدونی سپاہیوں کی، جنھیں وطن چھوڑے برسوں گزر گئے تھے، اشک شوی ہوجائے اور وہ اپنے ان فرضی رشتہ داروں میں چند روز آرام لے لیں۔ مگر اس کے علاوہ ایک یہ قیاس بھی ہو سکتا ہے کہ ان روایتوں میں یونانی مؤرخوں نے اپنے ممدوح کی ناکامی چھپائی ہے اور یہ وہ فن ہے جس میں قدیم اہلِ یونان ہی گویا یورپ والوں کے اُستاد ہیں۔

جنگ مساگا

اس قیاس کی بالواسطہ تصدیق شاید اُن روایات سے بخوبی ہوسکتی ہے جو کہ فتح مساگا کے متعلق یونانیوں نے بیان کی ہیں۔ اس بات کا ٹھیک ٹھیک پتہ نہیں چلتا کہ یہ مستحکم اور مرکزی شہر کہاں واقع تھا لیکن سکندر کا اسے حملہ کرکے چھین لینا وہاں کے

مقتول رئیس کی بیوہ سے شادی کرنا اور پھر اُن سات ہزار اجیر سپاہیوں کو یک بہ یک حملہ کر کے قتل کرا دینا جو یونانیوں کے ساتھ ہو کر لڑنے کا وعدہ کر چکے تھے اور پھر قلعے سے باہر آنے کے بعد بغیر وعدہ پورا کئے نکل جانا چاہتے تھے، ایسی روایتیں ہیں جن پر کسی طرح اعتبار نہیں آتا، اور بعض ہم عصر اہل مغرب کی تصانیف پڑھ کر خیال گزرتا ہے کہ انہوں نے بھی اہل ہند کے مقابلے میں ایک فرنگی بادشاہ کی بیجا پاسداری کی ہے[1]۔ سکندر کی بد عہدی کا خود یونانی راویوں نے دبی زبان سے ذکر کیا ہے لیکن تاریخی تنقید کے جدید اصول کی رو سے ان یک طرفہ روایتوں کو پڑھ کر اس نتیجے پر پہنچنا دشوار نہ ہوگا کہ فتح مساگا میں یونانیوں کی بہادری سے زیادہ اُن کے مکر و فریب اور ہندی وطن فروشوں کی غدّاری کو دخل تھا۔ پہلے ہی سکندر کے لشکر میں ہندوستان کے کئی رئیس و راجہ موجود تھے جنھوں نے محض باہمی نفاق اور ہمسائیوں کی رقابت میں حملہ آوروں کا ساتھ دیا تھا اور کابل کے علاقے سے ان کے ہمراہ تھے۔ بلکہ کچھ تعجب نہیں کہ انہی کی مدد کے بھروسے پر اس مقدونی کشور کشا نے ہندوستان میں بڑھنے اور اپنا شوق کشور ستانی پورا کرنے کی جراءت کی ہو۔

---

[1] اس کی سب سے اچھی مثال غالباً وہ "رائے زنی" ہے جو اس واقعہ پر ونسنٹ اسمتھ نے کی ہے۔ دیکھو ارلی ہسٹری آف انڈیا صفحہ ۵۶۔

دوسری فصل - جنگ پورس (۳۲۶ ق م)

بہر حال اب سکندر ہندوستان کے قدرتی کوہی مورچوں کو طے کرنے کے بعد میدانی علاقے کی طرف بڑھ رہا تھا - اس کی فوج کا ایک دستہ پہلے سے دریائے سندھ پر پہنچ گیا تھا اور ٹکسیلا کے راجہ کی مدد سے اُس مقام پر کشتیوں کا پُل تیار کر رہا تھا جو آج کل اوہند کہلاتا ہے - اسی جگہ راجہ (آمبھی) نے سکندر کا خیر مقدم کیا اور فروری یا مارچ ۳۲۶ ق م میں یورپ کا پہلا بادشاہ سندھ اُتر کے پنجاب کے علاقے میں داخل ہو گیا ۔ (سندھ سے عبور)

سکندر کے ہندی حلیف یعنی آمبھی کا پائے تخت ٹکسیلا دریا سے بیس پچیس میل آگے موجودہ راولپنڈی کے شمال مشرق میں واقع اور اُس زمانے میں ہندوستان کے سب سے بڑے شہروں میں شمار ہوتا تھا - ہندوؤں کے قدیم علوم خاص کر ہندی طِب کی تعلیم کا جو اہتمام اس شہر میں کیا گیا تھا، وہ شمالی ہند میں کہیں نہ ہوگا - چنانچہ وہاں کے مشہور مدرسے میں تعلیم پانے کے لئے دُور دُور کے طلبہ آتے تھے اور صاحبانِ علم کی بڑی قدر تھی - دولت و حشم کے اعتبار سے بھی یہاں کا راجہ اپنے مشرقی حریف (پورس) سے کچھ بہت کم نہ تھا اور اس نے کئی ہفتے تک شاہانہ کروفر کے ساتھ یونانی سپاہ کی مہمانی کی[1] (ٹکسیلا)

[1] اسی غرض سے تین ہزار گائیں یا بچھڑے بھی پال کر تیار کئے گئے تھے کہ یونانیوں کی

بقیہ نوٹ برصفحہ نمبر ۶۲

یونانی راوی لکھتے ہیں کہ اس نے کمال عجز کے ساتھ اپنا ملک و مال سکندر کے حوالے کر دیا تھا اور سکندر نے اُسے اس کی ریاست بخش دی اور اپنا باج گزار والی تسلیم کرلیا۔ افسوس یہ ہے کہ اس بارے میں خود اہلِ ہند کی کوئی تحریر ہمارے پاس نہیں ہے جس کی بنا پر یونانی روایات کی تصدیق یا تردید کی جا سکے۔ لیکن یہ بالکل یقینی بات ہے کہ یونانی مصنفوں نے اپنی شوکت نمائی کا پہلو ہمیشہ مدّ نظر رکھا اور تاریخی واقعات کے بیان کرنے میں رنگ آمیزی کی ہے۔ اسی لئے اگر ہم یہ کہیں کہ ٹکسیلا کے راجہ نے اپنے ہمسائوں کے خلاف سکندر سے مدد چاہی اور جب وہ آیا تو اپنی سیاسی مصلحتوں سے یونانی فوج کی بہت کچھ خاطر مدارات کی اور حلیف بن کر اپنے حریف راجہ پورس کو تباہ کرا دیا، توگو اس قول کی کوئی منقولی شہادت میسّر نہ آئے تاہم بعض قرائن اور آئندہ واقعات سے اس کو تقویت ہوتی ہے مگران قیاسات پر غور کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم یونانی روایات کے مطابق ان تمام واقعات پر ایک نظر ڈال جائیں جو سکندر کی ہند سے واپسی تک

ضیافت میں کام آئیں۔ اور اس واقعے سے ظاہر ہے کہ سکندر کی آمد تک ہندوستان کے اکثر حصّوں میں گاؤ کشی اسی طرح جائز تھی جس طرح "زمانۂ وید" میں (اوکسفورڈ ہسٹری۔ صفحہ ۵۹ و ۶۱) اسی ضمن میں یہ لکھنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ معتبر یونانی مصنّفین کی روایت سے ٹکسیلا میں تعدّدِ ازدواج اور ستی کی رسم کا ہونا بھی ثابت ہے مُردوں کو کھلی جگہ میں ڈال دینا کہ گدھ کھا جائیں، آگ کی پوجا یا اور بعض رسموں سے پتہ چلتا ہے کہ اُن دنوں ایرانی مذہب کے بعض عقائد بھی ہند کے مذہب و تمدن میں دخیل تھے گو

اسے پیش آئے۔

جہلم عبور کرنے کی کوشش

ٹکسیلا کے مقام سے ریاست بچ کے راجہ کو پیام بھیج دیا گیا تھا کہ سکندر کی اطاعت قبول کرے اور پیشوائی کے لئے اپنی سرحد پر حاضر ہو۔ ریاست بچ کا نام اپنی آسانی کے لئے ہم نے اختیار کر لیا ہے۔ معلوم نہیں قدیم زمانے میں اس ریاست کا علٰحدہ نام کیا تھا، جس کے متعلق صرف یہ پتہ چلتا ہے کہ اس میں دریائے جہلم اور چناب کے دو آبے کا علاقہ اور تین سو بستیاں شامل تھیں۔ اس دوآبے کو آج کل جہلم اور چناب کا نام ایک لفظ میں مخفف کر کے بچ یا چنبا کہنے لگے ہیں اور وہ شاہپور، گجرات، اور جہلم کے اضلاع پر مشتمل ہے۔ قدیم اور تاریخی ناموں کے متعلق ہماری کوتاہئی معلومات کا یہ حال ہے کہ خود "پورس" کا ہندی اور اصلی نام آج تک معلوم نہ ہوا۔ سکندر کے اس نامی حریف کو یونانیوں نے یہ نام دیا ہے اور مسلمانوں کی تصانیف میں اسے "فور ہندی" کہا گیا ہے جو پورس ہی کا معرّب ہے[1]۔ ہندوستان کی کسی پرانی کتاب میں اس کا ذکر نہیں ملتا اور اس لئے یہ محض قیاس ہی قیاس ہے کہ اس کا اصلی نام پورو ہوگا۔

بہر حال، راجہ نے سکندر کو جواب میں کہلا بھیجا کہ اس کا

---

[1] یعنی غالباً خود اسلامی مصنفین کی تحقیقات کو اس میں دخل نہیں اور معلوم ہوتا ہے اُن میں یہ نام یونانیوں کے ہاں سے آیا۔ ۱۲

خوشی سے استقبال کیا جائے گا۔ مگر ایسا جیسا کہ مردانِ جنگ کیا کرتے ہیں۔" پھر اپنی فوج آراستہ کی اور جہلم کے کنارے تک بڑھ آیا کہ یونانیوں کو دریا نہ پار کرنے دے۔ یہ سخت گرمیوں کا زمانہ تھا اور پہاڑوں کی برف پگھلنے سے جہلم چڑھا ہُوا تھا۔ ایک قوی دشمن کے مقابلے میں یونانی سپاہ دریا کو کسی طرح عبور نہ کرسکتی تھی لہذا مورّخ ایرّیان کے لفظوں میں سکندر نے "راستہ چُرانے" کی کوشش کی، یعنی چُھپ کر پار ہونا چاہا اور ظاہرا تو یہ اعلان کردیا کہ جہلم کو (پانی اترنے کے بعد) موسم سرما میں عبور کیا جائے گا لیکن خفیہ طور پر اپنے مقام سے سولہ سترہ میل شمال میں بہت سے تختے اور کشتیاں جمع کردیں اور ایک رات جب کہ سیاہ بادلوں نے اور بھی اندھیرا کر رکھا تھا وہ فوج کا چیدہ دستہ چکّر دے کے اس طرح دریا کے پار اُتار لایا کہ راجہ کے سپاہی خبردار نہ ہونے پائے اور صبح ہوتے پورس کو غنیم کے آنے کی اطلاع ہوی بھی تو اُس نے حملہ آوروں کی تعداد کا غالباً اتنا غلط اندازہ کیا تھا کہ اوّل اوّل کچھ جنگی رتھیں اور صرف دو ہزار سوار مقابلے کے واسطے بھیجے۔ جب یہ شکست کھا کے پسپا ہوے اور شاید یہ معلوم ہُوا کہ خود سکندر آگیا ہے، تو اس وقت پورس اپنی پوری فوج لے کے میدان میں آیا۔"

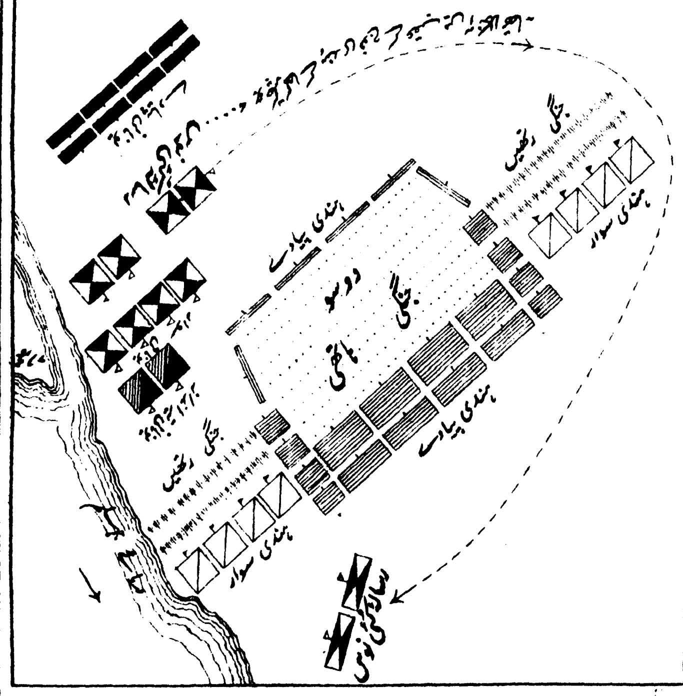
میدان اور تدابیرِ جنگ

یہ جگہ جسے کری کا میدان کہتے ہیں، موجودہ کشمیر کی سرحدی پہاڑیوں کے دامن میں واقع ہے۔ جہلم انگریزی علاقے میں

جنگِ پورس واقعہ ۳۲۶ سنہ ق م

(حسب نقشہ مرتبۂ مؤلفِ "ارلی ہسٹری آوف انڈیا")

ہندی پیادے . . . .
سوار . . . . .
جنگی رتھیں . . . .
ہاتھی . . . .
یونانی پیادے . . . .
سوار . . . . .
تیرانداز (سوار) . .



داخل ہوتے ہی جہاں خم کھا کے تھوڑی دور تک بہت چوڑا ہو گیا ہے اس کے شمال مشرق میں ایک ہموار پٹپڑ (یعنی جمی ہوی ریتی) قوس نما پہاڑیوں کی آغوش میں آجاتا ہے۔ جس کا طول دس بارہ میل اور بڑے سے بڑا عرض ۵ میل کے قریب ہوگا لیکن جنوب میں تنگ ہوتے ہوتے وہ دو میل سے بھی کم رہ گیا ہے اور نقشۂ جنگ کو دیکھتے ہی خیال گزرتا ہے کہ سکندر نے حریف کو اس جگہ کیوں نہ روکا کہ ہندی لشکر اپنی کثرتِ تعداد سے فائدہ نہ اٹھا سکتا۔ کیونکہ پورس کے آتے آتے غالباً اسے اتنی مہلت مل گئی تھی کہ طوفان میں بھیگے ہوے سپاہی اپنے کپڑے سکھا کر وہاں تک بڑھ سکتے تھے جس راستے سے پورس کی فوج میدان میں داخل ہو رہی تھی۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ گو ہندی پیادوں کی تعداد یونانیوں سے ڈھائی گنی (یعنی تیس ہزار) بتائی گئی ہے اور جنگی رتھوں، مہیب ہاتھیوں اور کثرت ساز و اسلحہ کے بیان میں یونانی مصنفوں نے اپنی انشا پردازی کا زور صرف کر دیا ہے[۱] بایں ہمہ چار ہزار ہندی سواروں کے مقابلے میں یونانی سواروں کی تعداد پانچ ہزار تھی اور یہی وہ فرق ہے جس نے جنگ کا فیصلہ کر دیا کیونکہ گو پورس میدان کے وسط یعنی سب سے عریض حصے تک بڑھ آیا تھا اور اُسے صف بندی کی بھی مہلت مل گئی تھی

---

[۱] ارلی ہسٹری اوف انڈیا صفحہ ۶۵ و ۶۶ - ۱۲

لیکن دونوں بازو جن پر جنگی رتھیں اور سواروں کا رسالہ تھا، کمزور تھے اور یونانیوں سے پہلا تصادم انہی کا ہوا۔ یعنے اوّل سکندر کے سوار تیر برساتے ہوئے ہندیوں کے بائیں پہلو پر آ گرے اور جب ان کی مدد کے لئے ہندی میمنے کے سوار بڑھے اور صفوں میں انتشار پیدا ہوا، تو یونانی رسالے نے دائیں پہلو پر حملہ کیا اور اس طرح ہندی سوار دونوں طرف سے پسپا ہو کر قلب لشکر کی طرف بھاگے جہاں ہاتھیوں کے پیچھے پیادوں کی فوجِ کثیر صف بستہ تھی۔ کہتے ہیں ان جنگی ہاتھیوں پر پورس کو بہت ناز تھا اور اس میں شک نہیں کہ جب یونانی قلب کے پیادے سامنے پہنچے تو ہاتھیوں کے پہلے ریلے نے ان میں تہلکہ ڈال دیا۔ لیکن سچ پوچھئے تو یہ عارضی کامیابی بھی آئندہ ناکامی کی دلیل تھی اور اس کے معنی یہ تھے کہ ہندی پیادوں کو میدانِ جنگ میں خاطر خواہ حصہ لینے کی نوبت ہی نہ آئے[1]۔ اس کے علاوہ بازوؤں پر

---

[1] "پورس کو اپنے ہاتھیوں پر بھروسہ تھا۔ مگر جنگ کے وقت وہ پوری طرح کام نہ دے سکے اور بعد میں بے قابو ہو کر انہوں نے دشمنوں کی نسبت دوستوں کو زیادہ نقصان پہنچایا۔ رتھوں کے تیرانداز سکندر کے سوار کمان برداروں کی ٹکر کے نہ تھے۔ ادھر میدان کی پھسلنی زمین نے ہندی پیادوں کو اپنی زبردست کمان سے کام نہ لینے دیا کیونکہ انہیں کمان کا ایک سرا زمین پر ٹیک کر بائیں پاؤں سے روکنے اور ہاتھ سے کھینچ کے تیر چلانے کی عادت تھی۔ ہندی پیادوں کے بائیں شانے پر بہت بھاری دو دستی تلوار اور حرم گاؤ کی بے منڈھی ڈھال تھی (اور اسے سنبھالنا دشواری سے خالی نہ تھا) اور بعض سپاہی کمانوں کی بجائے سانگ سے مسلح تھے۔" (اوکسفورڈ ہسٹری صفحہ ۶۴)

جو غلبہ سکندر کو حاصل ہو چکا تھا، اس میں ہاتھیوں کے وسطی حملے سے چنداں فرق نہ آیا اور ہندی سواروں کے منتشر ہوتے ہی دشمن کی پیادہ فوج کے دونوں پہلو سوارانِ یونان کی زد میں آگئے۔ اور یہ وہ خطرہ تھا جس کی پورس کوئی روک تھام نہ کرسکا۔ اُس کے جنگی ہاتھی زخم کھا کے بیقرار اور مہاوتوں کے قابو سے باہر ہو گئے تھے اور جدھر منہ اٹھتا، بھاگتے اور بلا امتیاز دوست دشمن کو روندتے چلے جاتے تھے۔ ان کا اگر زور تھا بھی تو میدان کے وسط میں تھا جہاں یونانی پیادے انہیں بڑھتے دیکھ کر اِدھر اُدھر بھاگ جاتے اور ہر طرف سے نیزہ و تیر کی بوچھار کر دیتے تھے۔ حتیٰ کہ ہاتھی سخت زخمی ہوکر گرنے لگے اور بھاگتے بھاگتے شل ہو گئے۔ ان میں کوئی ترتیب نہ رہ سکی اور اہلِ مقدونیہ کی پیوستہ صفوں نے ہندی قلب پر پوری قوت سے حملہ کیا۔ اس قلب کے دونوں بازوؤں کو یونانی سواروں کے پیہم حملوں نے پہلے ہی پریشان کر رکھا تھا، جس وقت یونانی پیادے اپنی برچھیاں تول تول کے بڑھے، تو پھر ہندی لشکر دیر تک میدان میں نہ ٹھیر سکا اور ایسا بے حواس ہوکر بھاگا کہ ہزاروں آدمی مارے گئے اور جو میدان سے نکل گئے تھے ان پر کراتروس کے تازہ دم سپاہیوں نے حملہ کیا۔ یہ سردار پڑاؤ پر چھوڑ دیا گیا تھا کہ راجہ کو سکندر کے لشکر سے نکل جانے کی خبر نہ ہو اور اسے ہدایت کر دی گئی تھی کہ جب ہندی فوج دریا کے پار لڑائی میں اُلجھ جائے تو موقع دیکھ کر وہ بھی جہلم کو عبور کر آئے۔

فتح کی یادگاریں

جنگ[1] میں راجہ پورس بھی گرفتار ہوگیا تھا لیکن سکندر نے نہ صرف اس کی ریاست اور جان اسے بخشی بلکہ کچھ اور علاقہ اپنی طرف سے دے کے اُسے اپنا وفادار حلیف بنا لیا۔ پھر اس فتح کی یادگار میں دو شہروں کی بنیاد رکھی جن میں پہلا سکندر کے محبوب گھوڑے بوکفالوس کے نام پر بوکفالیہ کہلاتا تھا اور اس کے کھنڈر موجودہ قصبۂ جہلم کے متّصل دریافت ہوئے ہیں۔ دوسرا (نکایا) غالباً خاص میدان جنگ پر بسایا گیا تھا جس کا اب کوئی نشان باقی نہیں۔ فتح کی تیسری اور دلچسپ یادگار اس سکّے کو سمجھا جاتا ہے جس کے ایک طرف سکندر کی برق بدست تصویر بنائی ہے اور دوسری طرف ایک مقدونی سوار بھاگتے ہاتھی کا پیچھا کر رہا ہے۔ بعض اہل تحقیق خیال کرتے ہیں کہ یہ سکندری فتح کی یادگار میں تمغے کے طریق پر یونانی سپاہیوں کو تقسیم کیا گیا تھا۔

بیاس تک پیش قدمی

پورس کی شکست کے بعد دُور تک کسی بڑے راجہ سے مقابلے کا خدشہ نہ تھا لہذا سکندر نے اپنے نئے باج گزار کے علاقے سے بہت جلد آگے کوچ کیا کیونکہ کہتے ہیں اُسے دریاے گنگا تک پہنچنے کا شوق تھا جسے قدیم یونانی دنیا کی مشرقی سرحد سمجھتے تھے۔ چناب و راوی کے عبور میں کوئی مزاحمت نہ پیش آئی۔ لیکن راوی کے مشرقی کنارے کے دیہات و

[1] اس لڑائی کی صحیح تاریخ تو معلوم نہیں لیکن وہ جون کے آخر یا شروع جولائی ۳۲۶ ق م میں واقع ہوی تھی۔ ۱۲

قبائل نے اس کی اطاعت قبول نہ کی اور ایک مرکزی قلعے میں محصور ہوکر بہت دن تک مقابلہ کرتے رہے۔ یونانیوں کی مدد کے لئے راجہ پورس بھی پانچ ہزار سپاہی لے کے آیا اور آخر سخت کشت و خون کے بعد غالباً ماہ اگست میں یہ قلعہ سر ہوگیا اور سکندر نے آگے مشرق کی راہ لی۔ مگر اس کے سپاہی اس قدر بد دلی سے کوچ کر رہے تھے کہ سکندر بھی اس بات کو سمجھ گیا اور اُس نے ان کے دل میں گرمی پیدا کرنے کی غرض سے دریائے بیاس کے کنارے پہنچ کر ایک پُرجوش تقریر کی۔ ان کے پچھلے کارنامے دہرائے، اور آئندہ فتوحات میں ناموری اور مال غنیمت کا لالچ دلایا۔ لیکن دیس کی یاد اور جسم کی تکان زبانی باتوں سے دفع نہ ہوسکتی تھی۔ اس کے مضمحل رفیق آگے بڑھنے پر کسی طرح آمادہ نہ ہوئے فتح ایشیا کے اس ناکام آرزومند کو طوعاً و کرہاً فوج کی واپسی کا حکم دینا پڑا ؛

تیسری فصل۔ سکندر کی مراجعت ہندوستان سے

دریائی سفر

واپسی میں سکندر نے کچھ روز جہلم کے کنارے کرّی کے میدان کے قریب قیام کیا۔ دریا کے دونوں طرف جو نئے شہر تعمیر کرائے تھے اُن کے آباد اور محفوظ کرنے کے متعلق بعض ہدایتیں کیں۔ راجہ پورس اور آمبھی کے علاوہ اور بھی کئی رئیسوں نے اس کی اطاعت قبول کرلی تھی، غالباً ان کے علاقوں کی حد بندی بھی اسی قیام کے زمانے میں کی گئی۔ دریائے سندھ کے مغرب میں سکندر نے اپنی ایک ولایت یا ستراپی پہلے بنا دی تھی اور

اس پر ایک یونانی سردار کو مقرر کر چکا تھا۔ لیکن سندھ اتر کے خاص ہندوستان کا کوئی حصہ اس نے براہ راست اپنے قبضے میں نہیں لیا بلکہ یونانی روایات کے بہ موجب سندھ سے جہلم تک آمبھی کی اور جہلم سے بیاس تک پورس کی عملداری رہی اور ان دونوں نے سکندر کی باج گزاری یا دوستی کا عہد کر لیا۔

اس اثنا میں ہر قسم کی چھوٹی بڑی کشتیاں فراہم کی جا رہی تھیں کہ ان میں فوج کا کچھ حصہ، ساز و سامان اور گھوڑے دریا کے راستے روانہ کئے جائیں۔ کشتیوں کی کل تعداد کم سے کم آٹھ سو اور زیادہ سے زیادہ دو ہزار بیان کی گئی ہے اور ان میں سب سے بڑے تیس چپّو کے آٹھ جنگی جہاز تھے اور گو یہ جہاز عرض و طول یا رفتار میں آج کل کے معمولی تجارتی جہازوں سے بھی کوئی مناسبت نہ رکھتے تھے، بایں ہمہ پنجاب کے دریاؤں میں اتنا بڑا بیڑا کبھی نظر نہ آیا ہوگا جسے خود سکندر ماہ اکتوبر ۳۲۶ ق م میں جنوب کی طرف لے جا رہا تھا۔ بیڑے کی حفاظت کے لئے باقی ماندہ یونانی فوج دریا کے دونوں کنارے پر منزل بہ منزل آگے جا رہی تھی اور اس کے سپاہیوں کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار سے بھی اوپر بتائی گئی ہے۔

راستے کی لڑائیاں

جہلم اور چناب کے سنگم[1] یعنی پورس کی جنوب مغربی

---

(۱) یونانیوں نے اپنے تلفظ میں اُن سب مقامات کے نام اور پتے بہ تفصیل تحریر کئے ہیں لیکن پنجاب کے دریاؤں کی گزرگاہ اس دو ہزار برس میں کہیں سے کہیں ہو گئی ہے اور اس لئے ان کے پرانے سنگم یا کنارے کے شہروں کا اب سراغ نکالنا محال ہے ۱۲

سرحد تک، کوئی خاص بات پیش نہیں آئی لیکن آگے چل کر سکندر نے راستے کے قریب بستیوں اور قبائل کو اپنا مطیع بنانا چاہا اور سب سے پہلی بڑی لڑائی آگ سوی نامی قوم سے پیش آئی۔ یونانی مورخوں نے ان کے پیادہ سپاہیوں کی تعداد تخمیناً "چالیس ہزار" بتائی ہے، جن میں سے ہزارہا قتل ہوئے اور ہزارہا غلام بنا کے بیچ دیئے گئے۔[1] اسی طرح قریوں اور قلعوں پر خون و آتش کا مینہہ برساتا ہوا، یونانی لشکر ملّی یا مالوی اور اُکسی درا کی وغیرہ آزاد قبائل کی سرحد میں داخل ہوا جو راوی اور جہلم کے سنگم سے لے کر مشرق کی جانب راوی کے دونوں طرف آباد تھے اور ملّی غالباً موجودہ ضلع منٹگمری تک پھیلے ہوئے تھے۔ سنسکرت کی صرف و نحو کی ایک مثال میں اتفاق سے ان قوموں کا اصلی نام محفوظ رہ گیا، اور مہابھارت میں بھی کئی جگہ ان کا ذکر آیا ہے جس سے یہ تصدیق ہوتی ہے کہ پہلی قوم مالو اور دوسری کشدرکا کہلاتی تھی۔ یونانی راوی لکھتے ہیں کہ ان ہمسایہ قوموں نے اپنے جھگڑے مُجھلا کر سکندر کے مقابلے میں ایکا کرنا چاہا تھا مگر ابھی وہ یہی بحث کر رہے تھے کہ سپہ سالاری کس قوم کے آدمی کو دی جائے کہ سکندر نے یک بہ یک قوم مالو پر تاخت کی اور اس حال میں کہ وہ بے ہتیار اپنے کھیتوں میں کام کر رہے تھے، ان کے ہزاروں آدمی مار ڈالے۔

---

[1] "ارلی ہسٹری" صفحہ ۹۵ - ۱۲

پھر شمال مشرق میں بہت دُور تک ان کا پیچھا کیا اور کہیں انہیں دم لینے کی مہلت نہ دی۔ آخر وہ راوی کے دوسرے کنارے پر ایک قلعے میں پناہ گزین ہوئے اور وہیں سکندر کے خطرناک تہوّر کا وہ واقعہ پیش آیا جس میں وہ خود قلعے کی فصیل پر چڑھ گیا اور دوسری طرف محصورین کے مجمع میں کود پڑا تھا۔ صرف دو آدمی اس کے ساتھ فصیل پر چڑھ سکے تھے اور پھر جوش میں یکبارگی بہت سے سپاہیوں کے چڑھنے سے وہ سیڑھیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ غرض بہت دیر تک وہ دشمنوں میں گھر کر تنہا لڑتا رہا اور آخر مقدونی فوج بہ مشکل کسی نہ کسی طرح قلعے میں گھس آئی تو زخمی بادشاہ کو غش آ رہے تھے اور بعد میں کئی مہینے تک وہ صاحبِ فراش رہا۔

۳۲۵ء (ق م) کے آغاز میں یونانی لشکر پنجاب کی سرحد اور دریاؤں کے آخری سنگم سے بڑھ کر ملک سندھ میں داخل ہوا جہاں تین چار بڑی بڑی ریاستیں تھیں اور ان کے معاملات میں برہمنوں کا بہت کچھ دخل تھا۔ چھ سات مہینے تک سکندر ان علاقوں میں تیغ زنی کرتا رہا اور جن رئیسوں نے اُس کی اطاعت قبول نہیں کی وہ مارے گئے یا قید کر لئے گئے۔ سکندر کے ناگہانی حملوں نے ملک بھر میں تہلکہ ڈال دیا تھا اور یونانی روایات کے بہ موجب صرف جنوبی سندھ کے معرکوں میں اسّی ہزار ہندوستانی قتل ہوئے اور بے شمار مرد و عورت غلام بنا کے بیچ دئے گئے۔[1]

[1] "ارلی ہسٹری" صفحہ ۱۰۱ - ۱۲

ایران کی روانگی

آخر خدا خدا کر کے یہ سیلاب جس کا اُتار' چڑھاؤ سے بھی زیادہ خوفناک تھا' ممالک ہند سے دفع ہوا۔ شہر پٹالا سے جو ان دنوں دریائے سندھ کے مثلث نما دہانے کے نقطۂ راس پر واقع تھا سکندر نے براہ کرمان ایران کی راہ لی اور بیڑا اپنے ایک سردار کو دیا کہ ساحل کے قریب چل کر خلیج فارس میں دریائے فرات کے کنارے تک پہنچ جائے اور اپنے بحری سفر کی مفصل سرگذشت پیش کرے۔ خود سکندر اور یونانی لشکر اکتوبر ۳۲۵ ق م کے اخیر میں چار مہینے کا آذوقہ ساتھ لے کر موجودہ بلوچستان کے راستے ایران روانہ ہوئے کہ ساحل پر جا بجا بیڑے والوں کی آسانی کے لئے ٹھیرنے کے مقام اور سامان خور و نوش مہیا کر دیں لیکن تھوڑی دُور چل کر اپنی ناواقفیت کے باعث وہ کوہ تلاری بند کے شمال میں بڑھ گئے اور ساحل بحر کی بجائے اس ریگستان کے سمندر میں جا گھسے جہاں پانی نایاب تھا اور اُس جاڑے کے موسم میں بھی دن کو بلا کی گرمی پڑتی تھی۔ سب سے بڑی مصیبت یہ کہ ریت میں سفر کرنا عذاب ہو گیا تھا اور انسان و حیوان کے پاؤں اندر دھنسے جاتے تھے۔ اس چند روز کی صحرا نوردی میں جس قدر آدمی ضایع ہوئے اُن کی تعداد ہندوستان کی تمام لڑائیوں کے نقصانات سے زیادہ تھی[1]۔ دوسرے جس قدر لوٹ کا مال

---

[1] بیوری تاریخ یونان آخری باب

ہندوستان سے باندھ باندھ کر لائے تھے وہ سب اسی ریگستان میں جہاں اپنا چلنا دشوار تھا، تلف کر دینا پڑا، اور جان سلامت لے کے گدروسیہ (کرمان) کے قدیم صدر مقام پورا (موجودہ بامپور) میں پہنچ جانا ہی بہت غنیمت سمجھے (جنوری ۳۲۴ ق م) بھوک پیاس کے مارے سپاہیوں نے کئی ہفتے یہاں آرام لیا پھر آہستہ آہستہ سفر کرتے ہوئے شاید ماہ مئی کے آغاز میں سوسہ پہنچ گئے۔

ہندوستانی صوبوں کا آزاد ہوجانا

سکندر کو ہندوستان سے پیٹھ پھیرتے دیر نہ ہوئی تھی کہ اس کے نئے مقبوضات میں بغاوتیں ہونے لگیں دریائے سندھ کے مشرق میں اُس نے براہ راست اپنا قبضہ نہیں رکھا تھا لیکن جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، مغرب میں اس نے اپنی سلطنت کے دو صوبے بنائے تھے اور ان کی حدود قریب قریب وہی تھیں جو آج کل صوبۂ سرحدی اور ملک سندھ کی ہیں۔ اس اعتبار سے کہ وہ ہندوستان پر مئی ۳۲۷ ق م میں بڑھا اور ۳۲۴ ق م کے اسی مہینے میں واپس پائے تخت ایران میں پہنچ گیا، سکندر کی ہندی مہم میں تین سال صرف ہوئے مگر سرحد ہندوستان سے رخصت ہوئے شاید تین مہینے بھی نہ گزرے ہوں گے کہ شمالی صوبے کے اجیر (ہندی ؟) سپاہیوں نے سازش کی اور وہاں کا یونانی عامل انہی اہل سازش کے ہاتھ سے مارا گیا، پھر ان بعید علاقوں پر قبضہ رکھنے کی سکندر نے جو تدابیر سوچی تھیں وہ عمل میں آنے نہ پائی تھیں کہ اگلے سال

موت نے خود اس کا کام تمام کر دیا (جون ۳۲۳ ق م) اور تھوڑے ہی عرصے میں نہ صرف یہ ہندی مقبوضات آزاد ہو گئے بلکہ ان یونانیوں تک کا کچھ پتہ نہ چلا جنھیں سکندر نے اپنے بناکردہ ہندوستانی شہروں میں بسا دیا تھا۔

بایں ہمہ یورپ کے بعض مصنف سکندر کے اس حملے کو یونانیوں کا عجیب و غریب کارنامہ بتاتے ہیں اور سکندر کے غیر معمولی اوصاف کی مدح میں انہوں نے صفحے کے صفحے بھر دئے ہیں۔ حالانکہ اگر یونانی روایات کی بلا رو رعایت تنقید کی جائے تو غالباً نتیجہ برعکس نکلے گا اور اس حملے میں نہ یونانیوں کی بہادری نظر آئے گی نہ دانائی نہ کامیابی! بلکہ ہندوستان کے چھوٹے چھوٹے رئیسوں کی لڑائیوں کو یونانیوں کا اس طرح بڑھا چڑھا کے بیان کرنا' پھر ان کے بقول سکندر کا قریب قریب ہر موقع پر بے خبری میں چھاپہ مارنا' نہتے دشمن پر ناگہاں ٹوٹ پڑنا (صفحہ ۷۲) یا دوستی کا عہد و پیمان کر کے یکایک حملہ کر دینا (صفحہ ۶۰) اس یونانی سورما کی جنگی قابلیت تک کو مشکوک کئے دیتا ہے۔ چنانچہ اس کی سپہ سالاری پر بھی جسے اب تک قریب قریب سب مانتے آئے تھے، تاریخ یونان کے نامور عالم بیلوخ نے حرف گیری کی ہے[۱] اور اس کی ذات کے متعلق تو گروٹ اور نی بہر جیسے اہل الرائے متفق ہیں کہ

---

[۱] انسائی کلو۔ جلد اوّل صفحہ ۵۴۹۔ کالم ۲ ؎

سکندر نہایت شہرت پسند اور خود پرست جابر تھا جس میں شاہانِ جابر کے تمام بُرے اوصاف موجود تھے[1]۔ اور ہمارے خیال میں اُس کے شوقِ خودنمائی کا سب سے بڑا ثبوت وہ احکام ہیں جو ہندوستان سے چلتے وقت اس نے ایک بہت بڑی "چھاؤنی" بنانے کے متعلق دئے تھے۔ اس چھاؤنی میں سپاہیوں کے کمرے اور اُن کے پلنگ اور اسلحہ وغیرہ سب اتنے بڑے بڑے بنوائے تھے جن سے یہ گمان ہو کہ یہ کسی چو گزی مخلوق کے برتنے کا سازوسامان ہے۔ اور ان فرضی یادگاروں کو بیاس کے کنارے چھوڑ جانے کا منشأ یہ تھا کہ اہل ہند کے دل میں عرصہ دراز تک یونانیوں کی عظمت وہیبت کا نقش رہے۔ یونانی راویوں کے متفق اللفظ ہونے کے باوجود، ونسنٹ اسمتھ اس روایت کو "سکندر اعظم" کی شانِ متانت و وقار کے خلاف بتا کر، اس کی صحت سے انکار کرتا ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ جو بندۂ لایعقل، سکندر کی مثل، بنی نوع سے اپنی پرستش کرائے، وہ اس قسم کی ہر "لایعنی حرکت" کا ارتکاب کرسکتا ہے!

اوصافِ ذاتی سے قطع نظر، خود یہ بات بحث طلب ہے کہ سکندر نے شاہِ فاتح کی حیثیت سے ہندوستان پر فوج کشی کی تھی یا راجہ ٹکسیلا کی مدد کے بھروسے پر محض شوقِ غارت گری اسے ادھر کھینچ لایا تھا۔ وجہ جو کچھ بھی ہو، اس میں کچھ شک

[1] انسائی کلو۔ جلد اول صفحہ ۹۷ ن کالم ۲ ؎

نہیں کہ یونانیوں نے سکندر اور اس کی فوج کی شجاعت و فتوحات کے متعلق جو عجیب عجیب افسانے مشہور کر رکھے ہیں، ہندوستان کی مہم میں ایک حد تک ان کی قلعی کُھل جاتی ہے۔ قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دارائے ایران پر (جس کے ادنیٰ جاگیر دار پورس اور مکانوس (سندھی) وغیرہ سے قوّت و ثروت میں کہیں بڑھ چڑھ کر ہوں گے) سکندر کے اس قدر آسانی سے غالب آنے کی وجہ کیا تھی؟ مشرقی اور مغربی مصنّفوں نے اس بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اس پر بحث کرنے کا یہ محل نہیں ہمیں ہند و ایران کا صرف یہ فرق دکھانا مقصود ہے کہ ایرانیوں نے سکندر کو اپنا قومی بادشاہ بنا کے سجدہ کیا، مگر ہندوستان میں صرف سرحدی اضلاع پر اس کی جو کچھ آو بھگت ہوی، وہ بالکل معمولی تھی اور اس کے جانے کے بعد تو بہت جلد اہلِ پنجاب و سندھ اس بات کو بھی بھول گئے کہ اس نام کا کوئی بادشاہ ان کے مُلک پر حملہ آور ہُوا تھا۔

حملہ کے بالواسطہ فوائد

اگرچہ سکندر کے اس حملے سے براہِ راست ہندوستان پر کوئی نمایاں اثر نہیں پڑا نہ اس کی فتوحات دیرپا ثابت ہوئیں۔ بایں ہمہ اہلِ مغرب کو شاید پہلی دفعہ تین برّی اور ایک بحری راستے کا علم ہوگیا جن سے وہ تجارت یا سیاحت کرنے ہندوستان آ سکتے تھے۔ کچھ عرصے بعد باختر میں نیم یونانی سلطنت قائم ہوی تو وہاں کے بادشاہ بھی انہی سکندری فتوحات کی بنا پر شمال مغربی ہند کی وراثت کا دعویٰ کرتے تھے۔ ان وجوہ کو پیش نظر

رکھ کر یہ کہنا کچھ بے بنیاد نہیں کہ حملۂ سکندری کی بہ دولت مغرب و مشرق میں رابطۂ باہمی کی نئی راہیں نکل آئیں اور ایک دوسرے سے مستفید ہونے کا موقع پیدا ہوگیا۔ چنانچہ بعض مصنّفوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بودھ مت کے آئندہ تغیرات میں اُن فلسفیانہ خیالات کو بھی دخل تھا جو یونان سے آئے تھے اور اسی طرح دینِ مسیحی کے بعض فرقوں نے بودھ مت کے عقائد اپنے مذہب میں شامل کر لئے تھے۔ یہ قیاسات غلط ہوں یا صحیح، اس بات کو بھولنا نہ چاہیئے کہ ہندوستان کی قومی معاشرت یا نظامِ سلطنت پر تو یونان کا کوئی اثر نہیں پڑا اور فنِ جنگ تک میں اہلِ ہند نے وہ سبق بہت جلد بھلا دیئے جو "سکندر کی تیز تلوار نے انہیں دئے تھے۔ چنانچہ ہند کے بادشاہ اپنی رتھوں اور جنگی ہاتھیوں کے بَل پر میدان میں نکلتے رہے، جیسا کہ قدیم سے دستور تھا × × × اور انہیں کبھی اس قسم کی جنگی قواعد اور یکبارگی حملے پر قدرت حاصل نہ ہوئی جو سکندری رسالے کی خصوصیات تھیں، اور جن سے سولھویں صدی عیسوی تک میں بابر نے کام لیا۔ اور کامیابی پائی"۔

(اوکسفورڈ ہسٹری صفحہ ۶۷)

باب پنجم

پہلی فصل ۔ چندر گپت کا زمانہ

ارتھ شاستر

چند سال ہوئے ریاست میسور کے سرکاری کتب خانہ سے کتاب " ارتھ شاستر" (یعنی اصول حکمرانی) کا ایک نسخہ برآمد ہوا جس کی تصنیف کو راجہ چندر گپت کے برہمن وزیر چانک یا کوتلیا نامی سے منسوب کرتے ہیں ۔ اس شخص کے متعلق بعض کہانیوں میں لکھا ہے کہ وہ جتنا بد سرشت تھا[1] اسی قدر خدا نے اسے بدصورت بنایا تھا؛ اس میں تو شک نہیں کہ چندر گپت کی تخت نشینی میں (۳۲۳ ق م) سازش و فریب کو بھی دخل تھا اور چونکہ مگدھ کے پہلے فرماں روا (مہاپدم نند راجہ) کو معزول اور قتل کرنے کے بعد رعایا کی وہ امیدیں پوری نہیں ہوئیں جو غالباً چندر گپت نے انہیں دلائی تھیں، پس عام طور پر اس کی طرف سے بد دلی پھیل گئی اور نئے بادشاہ کے تشدد[2] کا الزام اس کے چالاک وزیر کے سر پڑا؛

---

[1] ونسنٹ اسمتھ کا خیال ہے کہ ارتھ شاستر کے بعض فقروں سے مصنف "اتھروید" کا پیرو ثابت ہوتا ہے اور یہ خاص جادو اور شعبدوں کا وید سمجھا جاتا ہے ۔ (اوکسفورڈ ہسٹری صفحہ ۸۵)

[2] چندر گپت کی جابرانہ سختی اور مطلق العنانی کے متعلق ملاحظہ ہو اوکسفورڈ ہسٹری صفحہ ۷۵؛

بہر حال "ارتھ شاستر" اس بدنام وزیر کی تصنیف ہو یا نہ ہو، اتنا تو مسلّم ہے کہ وہ اسی چوتھی صدی ق م کے اواخر کی کتاب ہے اور اس میں خاص اپنے یا کچھ پہلے زمانے کے آئین مصنّف کی پیش نظر تھے :

" ارتھ شاستر" میں واقعاتِ تاریخی مذکور نہیں ہیں بلکہ اسے پڑھ کر ان کی طلب، اور نہونے کا تاسف، سوا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ بغیر ان کے ہم ان مدارجِ ارتقائی کا کچھ پتہ نہیں چلا سکتے جنھیں طے کر کے ہندوستان شخصی حکومت کی اُس آخری منزل تک پہنچ گیا تھا جس کا ارتھ شاستر میں حال بیان کیا گیا ہے۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ اپنی ابتدائی اور سادہ صورت میں شخصی حکومت محض بزرگِ یا شیخِ قبیلہ کی حکومت ہوتی ہے اور اس میں حقِ وراثت کو بھی کوئی دخل نہیں ہوتا۔ ریاست کا "ملک" موروثی بن جانا، شخصی حکومت کی دوسری منزل ارتقائی ہے اور اس کا آخری درجہ وہ ہے کہ بادشاہ موروثی اور بالکل مطلق العنان ہو اور کسی کو اس کے حکم کے خلاف لب کشائی کا حق نہ ہو۔ وہ ذرا سی بات پر جس دشمن سے چاہے لڑائی چھیڑ دے اور جن شرائط پر مناسب جانے صلح کرلے۔ ملک اس کی ذاتی جاگیر بن جائے اور اہلِ ملک آلات بیجان کی مثل اُس کے اشارے پر حرکت کریں!

شخصی حکومت کے اس درجۂ تکمیل کے لئے سلطنت کا وسیع ہونا ضروری ہے کیونکہ کسی چھوٹی ریاست کے موروثی مالک کو خدائی کا دعویٰ نہیں ہو سکتا نہ زیب دیتا ہے۔ یہ دوسری

بلت ہے کہ بعد میں بڑے بڑے بادشاہوں کی چھوٹے رئیس بھی نقل اُتارنی سیکھ جائیں اور اپنی اپنی جگہ وہی حرکتیں کرنے لگیں جن کی رسم بڑے درباروں میں پڑی تھی۔ غرض تاریخ میں ہندوستان کی پہلی شخصی حکومت سلطنت مگدھ میں قائم ہوی اور اسی کے واقعاتِ تاریخی کی نامیسّری کا افسوس ہے کہ اب ہم کسی طرح ان اسباب وحالات کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے جن کی بدولت اس مشرقی ریاست کو یہ فروغ حاصل ہوا کہ اس کی سرحدیں بنگالے سے پنجاب تک پھیل گئیں۔

توسیع سلطنت

اتنی بات یقینی ہے کہ چندرگپت نے بنی بنائی سلطنت پر قبضہ کیا تھا[1] اور اس کی قوّت ہندوستان کی تمام ریاستوں سے زیادہ تھی۔ رومی مصنف پلینی کی کتاب میں ان ریاستوں کی فوجی قوّت کا باہم موازنہ کیا ہے:-

(۱) مگدھ	۶ لاکھ پیادہ	۳۰ ہزار سوار	۹ ہزار جنگی ہاتھی
(۲) کلنگ	۶۰ ہزار "	۱۰ ہزار "	۷ سو "
(۳) تلکٹا	۵۰ " "	۴ ہزار "	" "
(۴) آندھر	ایک لاکھ "	۲ " "	ایک ہزار "

یہ عہد چندرگپت کے اعداد ہیں جو بلا شبہ مگاس تھنیز کی کتاب

[1] نند راجہ کی فوج ۲ لاکھ پیادہ ۲۰ ہزار سوار ۶ ہزار فیل جنگی پر مشتمل بتائی گئی ہے۔ (اسمتھ صفحہ ۱۲۵) لیکن پروفیسر رہس ڈیوڈ کے نزدیک خود چندرگپت کے زمانے میں پیادہ فوج کی تعداد ۶۰ ہزار ہونی چاہیئے جو کاتب کی غلطی سے ۶ لاکھ بن گئی ہے۔ ص ۲۶۶۔

"اندکا"سے" ماخوذ ہوں گے، اور اگر بالکل صحیح نہ مانے جائیں تو بھی یہ ظاہر ہے کہ مگدھ کی سلطنت سب پر فائق تھی اور نہ صرف کوسل کا قدیم راج اس میں جذب ہوچکا تھا، بلکہ سکندر کے جاتے ہی پنجاب بھی اس کی حدود میں داخل ہوگیا تھا۔ اور یہ دونوں اتنے قریب کے واقعات ہیں کہ ممکن ہے ان میں اور سکندر کی ہندوستان سے پسپائی میں کوئی تعلق ہو یعنی مگدھ کا نند راجہ یا اس کا عزیز چندر گپت سکندر ہی کو روکنے کے لئے بڑھا ہو اور سکندر یا اس کی فوج کو ہندی ٹڈی دل کا سامنا کرنے کی ہمت نہ پڑی ہو اور وہ سرحد ہی سے لوٹ مار کرتے واپس چلے گئے ہوں! کسی یونانی یا مغربی مصنّف کی تحریر سے اس قیاس کی تائید چاہنا فضول ہے۔ اُن سب نے سکندر کو بالاتفاق اتنا بڑا کشور کشا اور غیر معمولی سپہ سالار بنایا ہے کہ جس کے مقابلے میں دنیا کی کوئی قوت نہ ٹھیر سکتی تھی۔ قدیم ایران کے اثر سے دورِ متوسط کے مسلمانوں میں بھی اسی قسم کے عجیب عجیب افسانے مشہور ہوگئے تھے اور حال میں جن علما نے (جیسے جرمن پروفیسر بیلوخ نے) اس کی سپہ سالاری پر حرف زنی کی ہے انہوں نے بھی بالعموم ہندوستانی مہم کی یونانی روایات کو بجنسہٖ تسلیم کرلیا ہے حالانکہ ان کے مبالغہ آمیز ہونے سے کسی کو بھی انکار نہیں تو ان غیر اہم قرائن سے

لہ پلینی کا قول ہے کہ سکندر کے حملے کے وقت بھی دریائے سندھ تک مگدھ کے راجہ کی عملداری تھی۔ بدھسٹ انڈیا صفحہ ۲۶۷ بحوالہ پلینی ۶۲

قطع نظر جن پر مفصل بحث کرنے کی اس کتاب میں گنجائش نہیں، خود یہی واقعہ کہ ۳۰۳ ق م میں چندرگپت نے سلیوکوس (سلوکس) کو شکست فاش دے کر کوہستانِ سلیمان کے پار کا وہ سارا ملک لے لیا، جو اب دولت افغانستان کہلاتا ہے، مذکورۂ بالا قیاس کی بالواسطہ تائید میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ جنگی ساز و سامان اور غالباً تعداد کے اعتبار سے، سلیوکوس کا لشکر اپنے نامور آقا سے کہیں زیادہ طاقتور تھا اور بعض اقوال کے بہ موجب سلیوکوس نہ صرف سکندر کے مفتوحہ علاقے واپس لینا چاہتا تھا بلکہ مشرقی ممالک گنگا پر بھی اس کی نظر تھی[1]۔ کم سے کم وہ ان کے مقابلے کے لئے تیار ہو کر آیا تھا۔ بایں ہمہ لڑائی میں شکست کھائی اور اُلٹے اپنے تین صوبے (ست راپی) ہند کے فاتح راجہ کے حوالے کرنے پڑے۔ دوستانہ اور عزیزانہ تعلقات پیدا کرنے کی غرض سے اس نے اپنی بیٹی بھی چندرگپت کو بیاہ دی تھی۔ اور اسی کے ہمراہ یونانی سفیر مگاس تھنیز پاٹلی پترا میں بھیجا گیا تھا۔

دُوسری فصل۔ مگاس تھنیز کی تحریریں

یہ سفیر بہت دن تک مگدھ کے پائے تخت میں رہا اور اس نے ہندوستان کے جغرافی اور سیاسی حالات لکھے جن میں

---

[1] و۔ اسمتھ۔ صفحہ ۱۱۹۔

کچھ اُس کے ذاتی مشاہدات پر مبنی تھے اور بہت سی باتیں سُنی سنائی جمع کر دی تھیں۔ جیسا کہ ہم پہلے لکھ آئے ہیں، مگاس تھنیز کی اصل کتاب مفقود ہوگئی اور اب اس کے صرف وہ اجزا ملتے ہیں جنھیں دُوسرے مصنفوں (خاص کر ایریان) نے نقل کیا ہے۔ اور ان منقولات میں بہت سے قصّے ایسے ناقابلِ اعتبار ہیں کہ بعض اہل الرائے نہ مگاس تھنیز کو سچا جانتے ہیں اور نہ اس بات کا انہیں اطمینان ہے کہ یونانی مصنّفوں نے اس کے اقوال بجنسہٖ اور بلا کم و کاست نقل کر دیئے ہیں[1]۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ مگاسس تھنیز جس تمدّن میں خود پلا تھا، ہندوستان کا تمدّن اس سے بالکل مختلف تھا اور اس لئے وہ یہاں کی ہر چیز اور ہر آئین و رسم کو سخت حیرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور یہاں کی زبان اور عادات سے بہ خوبی واقف نہ ہونے کے باعث بعض باتوں کے کچھ سے کچھ معنی سمجھ لیتا ہے۔ جیسا کہ آج کل بھی تازہ ولایت انگریز ہندوستانیوں کے متعلق بعض اوقات عجیب عجیب خیالات قائم کرلیتے ہیں؛ مختصر یہ کہ اُس کی تحریر یا وہ اقوال جو اس سے منسوب ہیں، مطالعہ کرتے وقت ہمیں یہ تمام اسقام اور غلطی کے امکانات مدِ نظر رکھنے چاہئیں؛

راجہ کی ذات و مشاغل

چندرگپت کی نسبت مگاسس تھنیز کہتا ہے کہ وہ بالعموم

---

[1] بدھسٹ انڈیا، صفحہ ۲۶۱ وغیرہ؛

محل کے اندر اپنی خواصّوں میں گھرا رہتا ہے مگر دن میں ایک مرتبہ اُسے (یعنی بادشاہ کو) اپنی صورت لوگوں کو دکھانی ضروری ہے اور انہی اوقات میں وہ فریادیوں کی فریاد سنتا اور مقدمات کا فیصلہ کرتا ہے۔ جب وہ باہر آکر بیٹھے تو رسم ہے کہ چار نوکر اس کی چپّی کرتے اور ہاتھ پاؤں دباتے ہیں؎ شکار کا اسے بہت شوق ہے اور اس کے لئے ہانکا دے کر جنگلی جانوروں کو ایک مخصوص احاطے میں پہنچا دیا جاتا ہے جہاں وہ تیر سے اُن کا شکار کرتا ہے؎ ہاتھی، گینڈے، سانڈ اور مینڈھے کی لڑائی بادشاہ کی تفریح کا سامان ہے اور کبھی کبھی اس کے حضور میں پہلوانوں کی کشتیاں بھی ہوتی ہیں؎

شاہی محلات کے متعلق مگاس تھنیز کا بیان ہے کہ وہ سوس، وہمدان کے ایرانی محلوں سے بھی آرایش و شان شوکت میں بڑھے چڑھے تھے۔ یہ عمارتیں زیادہ تر لکڑی کی بنائی جاتی محلات شاہی

؎ (چندر گپت کے) "دربار میں تربیت یافتہ طوائف کی بڑی قدر ہوتی تھی اور یہ رسم بد تھوڑے دن پہلے تک ہندوستانی رئیسوں کے ہاں جاری تھی بلکہ بعض مقامات پر شاید اب بھی جاری ہو؎ چندر گپت کی سرکار میں یہ عورتیں خادمہ کی حیثیت سے گھر کا کام کاج کرتی تھیں۔ عطر لگانا، ہار گوندھ کے پہنانا، چتر برداری وغیرہ کی خدمات انجام دیتی تھیں۔ اور دربار میں سواری کے وقت جلو میں رہتی تھیں؎ عام رنڈیوں کی بھی سرکاری طور پر پوری نگرانی رکھی جاتی تھی اور اُن کو کچھ روپیہ سرکاری خزانے میں داخل کرنا پڑتا تھا۔ سولھویں صدی عیسوی میں دکن کی ریاست بجے نگر (Vijayanagar) میں اس قسم کی رسوم کا ثبوت ملتا ہے مگر حکومت موریا کے محکمۂ سراغ رسانی کو ان رنڈیوں سے خفیہ معلومات حاصل کرنے میں بھی کچھ عار نہ تھا" (آکسفورڈ ہسٹری صفحہ ۷۹)

تھیں لیکن ان کے ستون و رواق کو سونے کے پانی سے رنگ کر ان پر جا بہ جا سونے چاندی کی بیلیں چڑھاتے جن کی شاخوں پر زمرد کے طیور بنے ہوئے ہوتے تھے؛ زر و جواہرات کی یہ کثرت اب سے دو صدی پہلے تک ملکِ ہندوستان کا مایۂ امتیاز تھی لیکن یاد رکھنے کے لائق بات یہ ہے کہ اس قدیم زمانے میں بھی تہذیب و تمدن خاص کر شاہی آداب اور سامانِ عشرت و تکلفات میں ہندوستان کے درباروں پر ایران کا اثر نمایاں تھا اور وہاں کے بعض طریقوں کی تقلید کی جاتی تھی[1]؛

شہر "پاٹلی پترا" پائے تخت کے بیان میں مگاس تھنیز کی کئی تحریریں محفوظ ہیں قدیم ہندوستان کا یہ نامور شہر سون اور گنگا کے سنگم پر واقع تھا جہاں اب "پٹنہ" اور بانکی پور آباد ہیں۔ اور ان کی مثل اُس کی آبادی بھی عرضاً کم اور طولاً دُور تک پھیلی ہوی تھی۔ حفاظت کے لئے اس کے گرد شہتیروں کی نہایت مستحکم اور چوڑی شہر پناہ بنائی تھی جس میں ۶۴ دروازے اور ۵۷۰ برج تھے اور فصیل کی خندق کے لئے سون کا پانی آتا تھا۔ مگاس تھنیز اس خندق کا عرض دو سو گز اور گہرائی ۳۰ ہاتھ بتاتا[2] ہے۔ اور اتنی

---

[1] مثلاً راجہ بیماری میں "مقدس آتش" کے روبرو بیٹھکر اطبا سے مشورہ کرتا تھا یا "سر دُھلائی" کا دھوم دھام سے جلسہ کیا جاتا تھا اور یہ وہ رسم ہے جو شاہانِ ایران جشنِ سالگرہ کے وقت مناتے تھے۔ (آوکسفورڈ ہسٹری۔ صفحہ ۷۹)

[2] وی۔ اسمتھ صفحہ ۱۲۴

عریض خندق دنیا میں بہت کم کسی شہر پناہ کے گرد بنی ہوگی ؛ لیکن شاید سب سے زیادہ قابل ذکر وہ شہری مجلسین ہیں جن کا مگاس تھنیز نے تفصیل سے ذکر کیا ہے کہ کوئی جماعت تو صنعت و تجارت کی نگرانی کرتی تھی اور کسی کے سپردِ اہل شہر کی ولادت و اموات لکھنے کا کام تھا "تاکہ سرکار کو رعایا کے حال کی خبر رہے اور محصولات کے لگانے میں آسانی ہو" شہر کی ان سرکاری مجلسوں کے فرایض وضوابط اتنی وضاحت سے بیان کئے گئے ہیں کہ بعض جزئیات پُرگو راوی کی من گھڑت معلوم ہوتی ہیں اور بعض اوقات شبہ ہوتا ہے کہ کہیں یہ تمام "شہری نظام" کسی ذہین یونانی مصنّف کا نتیجہ فکر نہ ہو جس نے اپنے شہروالوں کو توجّہ دلانے کی غرض سے مگاس تھنیز کا قول بناکر اسے پاٹلی پترا سے منسوب کر دیا اور بعد میں عام طور پر اس کی روایت کو لوگ صحیح سمجھنے لگے ؟

فوجی نظم اور اسلحہ

تعداد فوج کے متعلق ہم اوپر پڑھ آئے ہیں کہ راجہ چندر گپت کے زمانے میں مگدھ کی جنگی قوت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی تھی اور اس کے لشکر میں ۶ لاکھ پیادہ ۳۰ ہزار سوار اور ۹ ہزار ہاتھی تھے ۔ مہاوت کے علاوہ، ہر ہاتھی پر تین تیر انداز ہوتے اور یہ میدانِ جنگ میں آج کل کے توپ خانے کی طرح سب سے آگے آگے رہتے تھے ؛ ان کے سوا، ۸ ہزار جنگی رتھیں تھیں اور ہر ایک میں کم سے کم تین لڑنے والے سپاہی ہوتے تھے رتھ میں دو

اور بعض اوقات چار گھوڑے لگاتے اور یہ بالعموم سواروں کے ساتھ فوج کے بازوؤں پر رہتی تھیں۔ سواروں کے پاس صرف دو بھالے اور ایک ڈھال ہوتی تھی لیکن پیادہ سپاہی تیغ سے مسلّح ہوتے اور سانگ یعنی چھوٹی برچھی (جسے پھینک کر مارتے ہیں) یا تیر کمان لئے رہتے تھے؛

یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ تمام فوج ایسے تنخواہ دار سپاہیوں کی تھی جن کا پیشہ ہی سپہ گری تھا اور جو اپنی چھاونیوں میں انہی مشاغل میں مصروف اور بادشاہ کے حکم پر جنگ کے لئے تیار رہتے تھے۔ ان کی نگرانی اور انتظام کی غرض سے ایک محکمۂ جنگ[1] قائم تھا جس کی چھ شاخیں تھیں۔ یعنی پیادہ و سوار فوج اور جنگی رتھوں اور فیل خانے وغیرہ کے انتظام کے لئے ایک ایک شاخ الگ بنا دی گئی تھی، اور ہر ایک میں پانچ پانچ عہدہ دار کام کرتے تھے؛

عام حالات

سلطنت کے مختلف صوبوں پر بالعموم شاہی خاندان کے افراد صوبہ دار مقرر کر دیئے جاتے تھے اور پرچہ نویسوں کے ذریعے ان کی خبریں راجہ کو پہنچتی رہتی تھیں اور اگر مگاس تھنیز کا قول صحیح ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ صدر حکومت کی عمّال و رعایا کے ہر طبقے پر کافی سے زیادہ نگرانی تھی اور جاسوسی کا

[1] "کتاب ارتھ شاستر" سے جس میں سلطنت کے تمام محکموں کے نام اور کام لکھے ہیں اس امر کی تصدیق نہیں ہوتی کہ محکمۂ جنگ بھی کوئی علیحدہ محکمہ ہوتا تھا۔ دیکھو اسمتھ صفحہ ۱۲۱

بہت بڑا محکمہ قائم تھا ؛

لیکن اس عہد کے لوگوں کی دماغی اور اخلاقی حالت کا شاید سب سے اچھا اندازہ جرائم اور سزاؤں کا حال پڑھ کر ہو سکتا ہے اور ان کی خاصی تفصیل ارتھ شاستر اور مگاس تھنیز کے اجزا میں موجود ہے :-

یونانی سفیر لکھتا ہے کہ ہندوستان میں جرائم کا ارتکاب کم ہوتا ہے اور جب ہوتا ہے تو اس کی نہایت سخت و عبرت انگیز سزائیں دی جاتی ہیں ۔ چنانچہ راجہ کی سواری نکلتے میں کسی کسی قسم کا ہنگامہ کرنا' یا ادائے محصول سے بچنے کی کوشش بھی سنگین سزا کے لایق سمجھی جاتی ہے ؛ بغاوت یا بادشاہ کے خلاف کسی قسم کی سازش سب سے بڑا جرم سمجھی جاتی تھی اور اس کے مجرم کو زندہ آگ میں جھونک دیتے تھے حتیٰ کہ برہمن بھی جنھیں سخت سے سخت جرم کی سزا میں صرف جلا وطن کرنا' جائز تھا مذکورۂ بالا جرائم کی پاداش میں سزائے موت کے مستوجب سمجھے جاتے تھے[1] اور اسی واقعے سے ہندوستان میں مطلق العنان بادشاہوں کا غیر معمولی مرتبہ ظاہر ہے کہ ان کی حفاظت کے لئے مذہب کے عزیز ترین اصول میں بھی استثنےٰ کر دیا گیا تھا ؛ سرکاری ملازمین کا آٹھ دس پَن چرا لینا انھیں سزائے موت کا مستوجب

---

[1] ملاحظہ ہو اوکسفورڈ ہسٹری + ۔صفحہ ۸۰

بنا دینا تھا۔[1] اور ونسنٹ اسمتھ کا قیاس ہے کہ پَن چاندی کا سکّہ ہوتا تھا جس کی قیمت تقریباً ایک انگریزی شلنگ کے برابر سمجھنی چاہیئے۔ اصولاً آنکھ کے بدلے آنکھ اور کان کے بدلے کان کا قانون رائج تھا لیکن بعض معمولی قصوروں پر بھی اعضا کی قطع و برید جائز سمجھی جاتی تھی اور ایک عجیب سزا یہ تھی کہ خاطی کا سر منڈ وا دیا جائے۔ اس "مجموعۂ تعزیرات" کا شاید سب سے خوفناک حصّہ وہ ہے جس میں اقبال جرائم کے لئے ملزم کو اذیت پہنچانے کی اٹھارہ شکلیں بیان کی گئی ہیں۔

وسائل آب پاشی

مگر مہاراجہ چندرگپت کے زمانے کی سب سے زیادہ قابل تعریف شے آب پاشی کے وسائل ہیں جن کا مختلف ذرایع سے اجمالی حال معلوم ہوا ہے۔ یہ تو یقین کے ساتھ کہنا مشکل ہے کہ چندرگپت یا اس کے کسی پیش رو نے باقاعدہ نہریں کھدوائی ہوں گی۔ لیکن ارتھ شاستر میں "آبیانے" کی مختلف شرحیں اور مگاس تھنیز کے بعض اقوال سے ثابت ہوتا ہے کہ بارش کے علاوہ بہت سے کھیتوں کو ندی نالے

---

[1] اتنی سخت سزا کے باوجود ارتھ شاستر سے معلوم ہوتا ہے کہ سرکاری ملازمین کی خیانت و رشوت ستانی کا کوئی انسداد نہ ہو سکا تھا، کیونکہ بقول مصنّف "جس طرح یہ معلوم کرنا غیر ممکن ہے کہ پانی کے نیچے مچھلی نے کتنا پانی پیا اسی طرح سرکاری عمّال کی چوری پکڑنی بھی محال ہے" ۱۲

تالاب یا اس قسم کے بند باندھ کر پانی دیا جاتا تھا جن پر سرکاری نگرانی رہ سکتی تھی۔ کم سے کم ایسے ایک بند کا حال تو یقین کے ساتھ ہمیں معلوم ہے جس کی سک (یا سکا Saka) قوم کے ایک صوبہ دار نے دوسری صدی عیسوی میں مرمّت کرائی تھی۔ اس صوبہ دار کا جو کتبہ گرنار (علاقہ کاٹھیاوار) سے برآمد ہوا ہے اس میں تحریر ہے کہ اس مقام پر سب سے اوّل چندرگپت کے صوبہ دار نے بند باندھ کر جھیل کا پانی روکا تھا لیکن اس بند کی تکمیل اشوک راجہ کے زمانے میں ہوی اور وہ چار صدی تک اس علاقہ میں آب پاشی کا نہایت عمدہ وسیلہ رہا۔ مگر جب ۱۵۰ء کے سخت طوفان میں بند ٹوٹا اور جھیل خالی رہ گئی تو اس وقت از سرنو اسے بنوایا اور مذکورہ بالا کتبہ کندہ کرایا گیا۔

اس واقعے سے نہ صرف سلطنت مگدھ کی وسعت بلکہ نظم و نسق کی بھی خوبی ثابت ہوتی ہے کہ موریا خاندان کے راجہ اپنے دور دراز کے صوبوں تک کی خبر رکھتے تھے اور انہیں اپنی رعایا خاص کر کاشتکاروں کی سہولت و رفاہ کا بڑا خیال تھا۔ مالگزاری کے قواعد و ضوابط ان کی انتظامی قابلیت کے گواہ ہیں جنھیں مگاس تھنیز اور کتاب ارتھ شاستر کے مصنّف نے جستہ جستہ نقل کیا ہے۔

چندرگپت کی وفات

غرض چوبیس برس تک کمال شان و شوکت اور حشمت و کامرانی کے ساتھ حکومت کر کے چندرگپت نے دنیا کی

ناپائیدار خوشیوں پر لات ماری اور سلطنت چھوڑ کر فقیر ہو گیا۔ یہ بیان جینیوں کی ایک مذہبی روایت پر مبنی ہے۔ انہی کا قول ہے کہ یہ راجہ جین مت کا پیرو تھا اور اسی ملت کے ایک گرو کے ساتھ جنوب کے جنگلوں میں نکل گیا تھا پھر وہیں (میسور کے علاقہ میں) اس نے فاقہ کشی کر کے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔ یہ عبرت ناک واقعہ صحیح ہو یا نہ ہو، کم سے کم ہمیں قدیم ہندوستان کے حکما کے عقائد و افکار کا سراغ دیتا ہے کہ وہ دنیا کی بڑی سے بڑی نعمت کو نہ صرف حقیر و ذلیل بلکہ قابلِ نفرین شے سمجھتے تھے اور ان کے نزدیک روح کی تمام آلایش و آلام کا سبب ہی جسمانی زندگی تھی جس کا خاتمہ کر دینا گویا روح کو عذاب الیم سے چھڑا دینا تھا۔

غرض خواہ چندر گپت نے اپنے پایۂ تخت میں مرگِ طبعی سے وفات پائی ہو یا سلطنت سے دست بردار ہو کر چلا گیا ہو، اتنا قریب قریب یقینی ہے کہ اس کا دَورِ حکومت ۲۹۸ سنہ ق م میں ختم ہو گیا اور اس کا بیٹا بِندُسار بادشاہی کا وارث ہوا۔

راجہ بندسار ۲۹۸ سنہ تا ۲۷۲ سنہ ق م

اس عہد کے ہمیں اتنے حالات میسر نہیں آتے جتنے چندر گپت کے زمانے کے معلوم ہیں۔ اور مگاس تھنیز کے بعد جو یونانی سفیر دربار مگدھ میں آکر رہے ان کی تحریریں اب بالکل مفقود ہو گئی ہیں۔ البتہ اس بات کے قرائن موجود ہیں کہ اس راجہ نے جانبِ دکن سلطنت کو وسعت دی اور نربدا کی

بجائے تنگ بھدرا اور پنیار نامی ندیوں سے بھی کچھ آگے بڑھ کر اس کی جنوبی سرحد قائم ہوئی ہے مگر یہ سب قیاسی باتیں ہیں اور بندسار کا نام اس وجہ سے اور بھی تاریکی میں چھپ گیا ہے کہ وہ اپنے سے زیادہ اقبال مند باپ کا بیٹا اور اس سے بھی زیادہ نامور بیٹے کا باپ تھا!

ؒ ملک تبّت کے ایک مورّخ (تارا ناتھ) نے یہ روایت نقل کی ہے کہ بندسار نے مشرقی اور مغربی سمندروں کے درمیان تمام ملک فتح کرلیا تھا۔

باب ششم

پہلی فصل۔ عہد اشوک (۱)

راجہ بندُ سار کے بیٹے کی بھی اگرچہ باقاعدہ تاریخ نہیں لکھی گئی لیکن بہت سی باتیں صحت و یقین کے ساتھ معلوم ہیں اور اُس کے مشہور کتبات پڑھ کر یہ دھندھلی تصویر آنکھوں میں پھرنے لگتی ہے کہ درویشی لباس میں ایک بادشاہ مصروفِ فرمان روائی ہے! مگر اشوک نے ہوش آتے ہی یا تخت پر بیٹھتے ہی یہ زہد و تقویٰ اختیار نہیں کیا تھا بلکہ معلوم ہوتا ہے بارہ تیرہ برس تک اس کی بادشاہی کا رنگ وہی رہا جو دنیا کے اَور طاقتور بادشاہوں کا ہوا کرتا ہے۔ اور اگر وہ ہاتھ جن سے اس نے سلطنت مگدھ کا تاج اپنے سر پہ رکھا، بھائیوں کے خون سے لال نہیں ہوے (جس کے متعلق قرائن کے سوا کوئی قابلِ سند تحریر نہیں ملتی) تو کم سے کم اُس کشت و خون کا جو ملکِ کلنگ میں ہُوا اصلی مُلزم وہی ہے؛

فتح کلنگ

کہنے کو تو وہ اپنے باپ کے مرتے ہی تاج و تخت کا مالک ہوگیا تھا مگر تخت نشینی کی رسم چار سال بعد (۲۶۹ق م) میں

ادا ہوی اور اسی وجہ سے اس قول کو تقویت پہنچتی ہے کہ گو باپ نے اُسے ولی عہد بنا دیا ہو لیکن دوسرے بھائی بھی تخت کے دعوے دار تھے اور یہ چار سال انہی کے ساتھ جنگ و کشمکش میں گزرے۔ غرض تخت نشینی کے نویں برس عہد اشوک کا پہلا واقعہ جو ہمیں معلوم ہو سکا وہ ملکِ کلِنگ پر فوج کشی ہے جہاں مگدھ کے ہمسائے میں خود مختار سلطنت قائم تھی۔ بلکہ مگاس تھنیز نے ہندوستان کی جن ریاستوں کا مجمل حال لکھا ہے اُن میں فوجی قوّت کے اعتبار سے مگدھ کے بعد دوسرا نمبر کلِنگ ہی کا سمجھنا چاہیئے کیونکہ ریاستِ آندھر میں اگر پیادہ فوج اور ہاتھیوں کی تعداد زیادہ تھی تو سوار فوج کا شمار کلنگ کی نسبت ایک چوتھائی سے بھی کم تھا (دیکھو صفحہ ۸۲) بایں ہمہ یہ ریاست مگدھ کا مقابلہ نہ کر سکی اور سخت کشت و خون کے بعد اشوک نے اسے فتح کر کے اپنی سلطنت کا صوبہ بنا لیا۔ اور اب مگدھ میں بنیار ندی تک (موجودہ نیپال و افغانستان سمیت) تمام ہندوستان کا علاقہ داخل ہو گیا اور یہ اتنی بڑی سلطنت تھی کہ زمانۂ تاریخی میں نہ پہلے کبھی یہاں قائم ہوی تھی اور نہ آئندہ کسی ہندو راجہ کے نصیب میں آئی۔ لیکن فتح و کامرانی کی مسرت کے ساتھ صاحب فکر فاتح کے دل پر ان عظیم مصائب کا بڑا اثر ہوا جو ملک مفتوحہ کے باشندوں کو برداشت کرنی پڑی تھیں اور اس کا

ایک ثبوت تو وہ کتبات ہیں جن میں مفتوحہ ملک کے عمّال کو بہ تاکید ہدایت کی ہے کہ رعایا پر کمال شفقت و انصاف کے ساتھ حکومت کریں، اور دوسرا ثبوت وہ اندرونی تغیّر ہے جس نے فاتح کو آخر کار بودھ مت کا پیرو بنا دیا۔

کتبات ان کتبات کی تعداد جو اب تک دستیاب ہوئے، ۳۴ ہے اور عجب نہیں کہ آئندہ بھی اس میں اضافہ ہوتا رہے۔ کیونکہ میسور سے ہمالیہ اور خلیج بنگال سے بحر عرب کے ساحلوں تک مختلف مقامات پر ان کا پتہ چلا ہے اور اتنے وسیع رقبے میں بہت ممکن ہے کہ بعض کتبے ڈھونڈنے والوں کی نظر سے چھپے رہے ہوں۔ مخفی رہنے یا ضایع ہو جانے کا ایک سبب یہ ہے کہ بعض کتبے پہاڑ کی چٹانوں پر کھدوا دیئے گئے تھے اور بعض پتھر کے میناروں پر کندہ ملے ہیں۔ سنینِ کتابت کے اعتبار سے ان کی چار قسمیں کی جا سکتی ہیں :-

(۱) "چٹان کے کتبات" جن میں "کلنگ کے فرامین" بھی شامل ہیں، ۲۵۷ء و ۲۵۶ء ق م میں کندہ ہوئے اور ان میں "چٹان کے چودہ[۱۴] فرامین" سب سے زیادہ کار آمد ہیں جن میں اشوک نے اپنے مذہبی عقائد اور اصولِ حکومت کا ذکر کیا ہے اور اپنے عمّال کو بھی انہی کے مطابق چلنے کی تاکید کی ہے۔

(۲) تین "غاروں کے کتبے" جو ضلع گیا سے برآمد

ہوے ہیں اور جن کی تاریخ کتابت ۲۵۷ء اور ۲۵۰ء ق م ہے اشوک نے بہت سا روپیہ صرف کر کے اُن غاروں میں قابل سکونت مکانات بنوا دئیے تھے اور انہیں سنیاسیوں کے ایک فرقے کو دے دیا تھا جو بہ اعتبارِ عقائد بودھ مت سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ لہذا ان مختصر کتبوں سے بھی اتنا پتہ چلتا ہے کہ بودھ مت کا نہایت پر جوش حامی ہونے کے باوجود اشوک دوسرے مذہب کے فقرا کا خیال رکھتا تھا؛

(۳) ”ترائی کے دو میناری کتبے“ جو ۲۴۹ء میں نصب کئے گئے تھے۔ یہ تحریریں اس بات کا ثبوت ہیں کہ راجہ اشوک نے واقعی نیپال کے ان علاقوں کا سفر کیا تھا جو بودھ مت والوں کے نزدیک گوتم کا مولد ہیں؛

(۴) ”میناری کتبات“ جو ۲۴۳ء سے ۲۴۰ء ق م تک کی یادگار ہیں۔ ان میں اوّل کے سات کتبوں کا مضمون وہی ہے جو پہلے چٹانوں پر کندہ کرایا گیا تھا یعنے وہی احکام زیادہ مفصل اور تاکیدی پیرائے میں میناروں پر کندہ کرا دئیے ہیں اور باقی تین چھوٹے میناروں کے کتبات میں بودھ مت کے اندرونی اختلافات کا ذکر ہے؛ ومای۔ بی

یہ بات خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ یہ سب کتبے کسی ایک زبان میں لکھے ہوے نہیں ہیں بلکہ جس ملک میں جو بولی یا پراکرت رائج تھی وہاں کے کتبے میں اسی سے

کام لیا گیا ہے ۔ اور پیرایۂ بیان سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جب اشوک نے یہ مذہبی احکام و ہدایات کندہ کرائی ہیں، اس وقت ملک میں بودھ مت عام طور پر شایع ہو چکا تھا اور عوام الناس میں بہ کثرت اس کے ماننے یا کم سے کم جاننے والے موجود تھے ۔ کتبات کے کندہ اور نصب کرانے کے واسطے وہی مقامات منتخب کئے گئے ہیں جو تیرتھ جاترا یا کسی عام شاہراہ پر واقع تھے ۔

مینار اور دیگر عمارات

اشوک کی مینار یا لاٹھیں جن میں سے بعض پر کتبہ کندہ ہے اور بعض پر نہیں ہے، ہند کی قدیم سنگ تراشی کا بے بہا نمونہ ہیں ۔ ان میں سے بعض کی بلندی پچاس فیٹ کے قریب ہے اور وہ سب پتھر کی ایک ڈال کو گول تراش کر بنائی گئی ہیں ۔ اشوک نے ایسی بہت سی لاٹھیں جا بہ جا نصب کرا دی تھیں اور یہ اس کے ذوقِ تعمیر کی ادنیٰ یادگاریں ہیں ورنہ عام روایات میں اسے ہزاروں عمارتوں کا بانی قرار دیا گیا ہے جن میں شاہی محل، گنبد، خانقاہیں وغیرہ ہر قسم کے مکان شامل تھے ۔ شان شوکت اور نقش و نگار کے اعتبار سے یہ بادشاہی عمارتیں صدیوں تک دنیا کے عجائبات میں شمار ہوتی تھیں لیکن زمانے کی گردش نے آج اُن کا کوئی نشان باقی نہیں چھوڑا اور اس عہد کے اگر آثار قدیمہ کہیں ہیں تو صرف قصبۂ سانچی میں جو اجین سے تقریباً سو میل مشرق میں واقع ہے ۔

ولیعہدی کے زمانے میں اشوک، اجین کا صوبہ دار تھا اور اس نے اسی علاقے میں شادی کر لی تھی پس قرینہ کہتا ہے کہ یہاں کی سب نہیں تو بعض عمارات ضرور اس کے حکم سے تعمیر ہوی ہونگی۔

سنگ تراشی

اشو کی عمارات کے منہدم اور بے نشان ہو جانے کے باوجود، میناروں کے علاوہ، اس عہد کی سنگ تراشی کے بعض اور نمونے بھی باقی رہ گئے ہیں۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ اس فن کو ہندوستان میں سب سے اوّل اسی زمانہ میں فروغ ہوا[1]۔ کیونکہ اشوک سے پہلے عمارات میں پتھر کا استعمال بہت کم ہوتا تھا اور جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے، تعمیر و آرایش کے لئے زیادہ تر لکڑی یا ہاتھی دانت سے کام لیتے تھے۔ مگر اشوک زیادہ دیرپا شے کا خواہاں تھا اور ہندوستانی کاریگروں میں بھی اس بات کی استعداد موجود تھی کہ لکڑی کی بجائے پتھر پر اسی قسم کی صناعی دکھا دیں۔ چنانچہ "وہ بہت سی جُزئیات ظاہر کرتی ہیں کہ یہاں کے سنگ تراش لکڑی اور دانت کے کاریگروں کی تقلید کرتے تھے" اور گو اس فن میں ہندوستان والوں نے اہل ایران و یونان سے استفادہ کیا تھا تاہم اس وقت کے جو نمونے موجود ہیں اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ کم سے کم

[1] اوکسفورڈ ہسٹری۔ صفحہ ۔ ۱۱۱

عہد اشوک میں ہندی کاریگر خود استاد فن ہو گئے تھے اور انہوں نے ہندوستانی سنگ تراشی کو ممالک غیر سے بالکل جداگانہ اور ممتاز بنا دیا تھا۔ چنانچہ بنارس کے قریب قصبہ سارناتھ سے اور بعض دیگر مقامات سے سنگ تراشی کے جو نمونے دستیاب ہوئے ہیں، قدیم یونان و ایران میں ان کی نظیر ملنی دشوار ہے اور ہمارے زمانے کے ایک مبصّرِ فن[1] کی رائے میں "باقاعدگی اور صحّتِ تراش کے لحاظ سے ایتھنز کی عمارات کی بہترین دستکاری بھی ان سے بڑھ کر نہیں ہے۔"

دوسری فصل۔ عہدِ اشوک (۲)

مذکورۂ بالا کتبات و فرامین سے اس "دھم" (دھرم) یعنی "قانونِ فرائض" کو سمجھنا آسان ہے جس پر اشوک اپنی رعایا کو چلانا چاہتا تھا۔ درحقیقت یہ "بودھ مت" کے بڑے بڑے اصولوں کی عملی تعلیم تھی اور اس کے تین بنیادی عقائد تھے:- (۱) جیو رکھشا یا "آہمسا" یعنی جانداروں کو تکلیف نہ دینا (۲) معلّم، والدین اور بزرگوں کا ادب اور

[1] سر جان مارشل۔ ناظم آثار قدیمہ ہند۔

(۳) راست گفتاری ۔

جیورکھشا تناسخ اور "کرم" کا مسئلہ ہندوستان کے قریب قریب ہر قدیم مذہب میں کسی نہ کسی پیرایۂ میں تسلیم کیا گیا ہے۔ بودھ مت بھی روح کے وجود سے منکر ہونے کے باوجود اِن کی صداقت کا قائل تھا اور چونکہ اس عقیدے کی رُو سے ایک ذلیل کیڑا آئندہ کسی جُون میں دیوتا کے درجے تک ترقی کر سکتا ہے اس لئے ہر جاندار کی جان اسی قدر واجب احترام ہے جس قدر کہ انسان کی اور کسی جاندار کو آزار پہنچانا گویا گناہِ کبیرہ کا ارتکاب کرنا ہے۔ حتّیٰ کہ بودھ اور جَین مت کے بعض فرماں رواؤں کو اس بارے میں یہاں تک غلُو تھا کہ جانوروں کی جان کا آدمی کی جان سے بھی بڑھ کر احترام ملحوظ رکھتے تھے اور اشوک نے بھی جانور کو مارنے کی سزا "موت" رکھی تھی جیسا کہ اس کے میناری کتبے میں صراحت کے ساتھ مرقوم ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بودھ مت کا حلقہ بگوش ہونے سے پہلے جب وہ خونخوار شِیو کا پرستار تھا، تو اس کے دسترخوان پر بیسیوں قسم کا گوشت چُنا جاتا تھا اور شاہی ضیافتوں کے موقعے پر سیکڑوں جانور مارے جاتے تھے لیکن رفتہ رفتہ یہ طریقہ بالکل موقوف ہو گیا اور شکار کی قدیم رسم شاہانہ بھی قطعاً ترک کر دی گئی (۲۵۹ھ، ۲۵۸ھ ق م) پھر ۲۴۳ھ میں ایک مفصل قانون شائع کیا گیا جس کی ہر شخص کو خواہ

وہ کسی مذہب و ملت کا ہو، پابندی لازمی تھی۔ اس قانون میں بعض جانوروں کو مارنے کی قطعاً ممانعت کر دی گئی تھی اور گوشت خواروں کو جن جانوروں کے کھانے کی اجازت دی گئی تھی ان کے متعلق بہت سی قیود بڑھا دی تھیں[1]۔

ادب اور سچائی

اس ”دھرم“ کا دوسرا اصول بزرگوں کی تعظیم و تکریم اور تیسرا راست گفتاری ہے جس پر اشوک اپنے فرامین میں بار بار زور دیتا ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ ان اخلاقی فرائض کے واسطے سرکاری قواعد و ضوابط بنانا اتنا کار آمد نہیں ہو سکتا جتنا کہ خود لوگوں کا ان کی خوبیاں سمجھ کر ان پر عمل کرنا مفید ہے۔ چنانچہ اپنے آخری کتبے میں خود اشوک معترف ہے کہ یہ سرکاری قواعد محض لوگوں کی رہ نمائی کے واسطے بنائے گئے ہیں ورنہ عمدہ اخلاق اور نیکی اختیار کرنے کی بہترین سبیل یہ ہے کہ خود لوگ غور و فکر سے کام لیں۔

احتساب

لیکن واضح رہے کہ اشوک نے ان قوانین کو فقط کندہ کرا دینے پر اکتفا نہیں کی تھی بلکہ یہ بات تمام بڑے

[1] یہ عجیب بات ہے کہ اشوک نے جن جانوروں کو مارنا ممنوع قرار دیا ہے ان میں گائے بیل اور سینگ والے جانور شامل نہیں ہیں اگرچہ اس سے پہلے ان جانوروں کو مارنے پر جرمانے کی سزا دی جاتی تھی۔ لیکن اشوک نے اتنی سزا کو بھی اپنے قانون میں جائز نہیں رکھا۔

(دیکھو وی اسمتھ فٹ نوٹ صفحہ ۱۷۷)

بڑے سرکاری عہدہ داروں کے فرائض میں داخل تھی کہ وہ مقررہ ایام میں اپنے مستقر پر اور جب دَورے پر جائیں تو دیہات میں عام جلسے کر کے اپنے مالگزاروں اور زمینداروں کو "دھرم" کی تعلیم اور قوانین شاہی کے مطابق عمل کرنے پر زور دیں۔ اس کے علاوہ ایک خاص محکمۂ احتساب قائم کیا گیا تھا اور اس کے عہدہ داروں کا کام ہی یہ تھا کہ لوگوں کے افعال کی نگرانی کریں اور بلا لحاظ مذہب و حیثیت جو شخص مذکورۂ بالا اصولوں کے خلاف چلے اسے سزا دلوائیں۔ تاریخی مواد اور کتابیں میسّر نہ آنے کی وجہ سے یہ تو یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ بادشاہ کی ان کوششوں کا کیا نتیجہ ہوا اور اسے اپنے منشاء میں کس حد تک کامیابی نصیب ہوی۔ لیکن مطلق العنان حکومت کا زور اور بادشاہ کو اپنے قانون کے رائج کرنے میں جس قدر انہماک اور جوش تھا اسے دیکھ کر یہ بہ آسانی سمجھ میں آ سکتا ہے کہ کم سے کم عہدِ اشوک میں اہل ہند ان اخلاقی قواعد و ضوابط کے پابند تھے اور جو دل سے نہ مانتے ہوں وہ بھی ان کی ظاہری تعمیل پر مجبور تھے۔

مالک
لیغ

اس مذہبی جوش کا اقتضا یہ تھا کہ ان کوششوں کو اپنی مملکت تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ گوتم بودھ کی ہدایت کے بہ موجب ممکن ہو تو ساری دنیا میں "دھرم کا ڈنکا" بجا دیا جائے۔ خاص اپنی رعایا میں اس اخلاقی تعلیم کو

پھیلانے کی جو تدبیریں اشوک نے اختیار کی تھیں وہ سب اس کی ذہانت اور دماغی محنت کا نتیجہ تھیں اور غالباً پہلے کسی راجہ مہاراجہ نے اپنی سیاست و قوت کو ایسے مذہبی کاموں میں صرف کرنے کا ارادہ بھی نہ کیا ہوگا ۔اسی طرح بیرونی ممالک میں اپنے دین کی تبلیغ کرنے کا کسی ہندی کو سب سے پہلے خیال آیا تو وہ بھی مگدھ کا یہی نامور بودھ راجہ ہے ۔اس کے واعظ تبت افغانستان اورشمالی دکن کی بعض خراج گزار ریاستوں میں گئے بلکہ انتہائے دکن اور لنکا تک پہنچے اور کتبوں کا اعتبار کیا جائے تو مصر و یونان کے بعید ممالک بھی اس تبلیغ کے دائرے سے باہر نہ رہے۔ لیکن اس آخری قول کی تصدیق میں جو دلیلیں پیش کی جاتی ہیں وہ کمزور ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ اشوک کا یہ محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے جو غالباً اپنے مذہب کی شوکت نمائی کے لئے اس نے کتبات میں کندہ کرا دیا ہے[1]۔

لنکا میں کامیابی

بہر حال، اس کوشش میں سب سے بڑی کامیابی جزیرہ لنکا میں حاصل ہوی جہاں اشوک نے خاص اپنے بھائی مہندر یا مہندا کو سرگروہ بنا کے بھیجا تھا ۔اس کے ساتھیوں کی تقریر اور ایسے طاقتور بادشاہ کے اثر سے

[1] رہس ڈیوڈ اس دعوی کی جن دلائل و قرائن سے تردید کرتے ہیں ان کے لئے دیکھو "بدھسٹ انڈیا" صفحہ ۲۹۸ ۔

راجہ لنکا (ٹیسا) اور اس کے امیروں نے بودھ مت قبول کر لیا اور چند ہی سال میں یہ مذہب اس ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل گیا۔ حتیٰ کہ اگر صحیح معنے میں کوئی قوم آج تک بودھ مت کی پیرو ہے تو وہ لنکا ہی کے سنگھالی ہیں جن کی تعداد اکیس لاکھ سے کچھ اوپر ہے؛

دیگر بعید ممالک میں اس تبلیغ و دعوت کا جو کچھ اثر ہوا ہو اس کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کرنا دشوار ہے اور خود یہی امر مشتبہ ہو گیا ہے کہ اشوک نے کون کون سے ملکوں میں دُعاۃ بھیجے تھے؛ البتہ یہ بات قریب قریب ہر محقّق کو تسلیم ہے کہ بودھ مت کو محض ایک مقامی فرقے کی بجائے مذاہب عالم کی صفِ اوّل میں پہنچا دینے والا اشوک ہی ہے۔ اور ہندوستان کے باہر اس مذہب کے جس قدر نام لیوا پائے جاتے ہیں وہ سب مگدھ کے اسی راجہ کے رہینِ مِنّت ہیں جس نے غیر ملکوں میں تبلیغ و دعوت کی بنا ڈالی تھی اور اپنی زندگی ہی میں اس کام کو ایسے وسیع پیمانے پر شروع کر دیا تھا کہ بعد میں صدیوں تک اس کا اثر قائم اور وہ کام جاری رہا؛

تیسری فصل۔ اشوک کے ذاتی حالات اور جانشین

"اپنے مذہب اور اخلاقی نظام کی تعلیم کو پھیلانے کی

جس شد و مد سے اشوک نے کوشش کی وہی اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ وہ اپنے مقصد کو سچا جانتا تھا اور اس لئے اپنی دین داری کا جو اظہار اس نے کتبات میں کیا ہے اُسے جدید اہل تحقیق درست سمجھیں تو بالکل بجا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "لوگوں کی بھلائی کے واسطے کام کرنا میرا فرض ہے" اور بے شبہ اُس نے یہ فرض ادا کیا۔ اس کے کاموں کا ثمرہ آج تک اہل دنیا کے سامنے ہے اور اس کے اقوال میں 'جو گم ہوگئے تھے اور اب پھر ان میں آواز بھری گئی ہے" صداقت و اخلاص کی گونج ہے؏

"اشوک نہایت مشقّت پسند فرماں روا تھا۔ ہسپانیہ کے بادشاہ فلپ ثانی کی طرح کام کرنے سے کبھی نہ تھکتا اور ہر وقت اور ہر جگھ ملک کے حالات سننے کے لئے تیار رہتا تھا۔ اور پھر بھی اُسے اپنے کام سے سیری یا تشفّی نہ ہوتی تھی۔ چنانچہ خود شکایت کرتا ہے کہ "مجھے اپنی محنت اور سرعت کار پر کبھی پوری طرح اطمینان نہیں ہوتا" معلوم ہوتا ہے کہ اشوک ضرورت سے زیادہ محنت کرتا تھا اور عجب نہیں کہ اگر اتنی زیادہ درد سری نہ اٹھاتا تو زیادہ کام کر جاتا۔ مگر اس نے ادائے فرض کا جو تصور اپنے ذہن میں قائم کیا وہ بہت بلند تھا فلسفہ رواقیہ کے ماننے والوں کی طرح اسے اپنی فطرت کے احکام ماننے لازمی اور بلا لحاظ کامیابی و ناکامی محنت کئے جانا مقدر تھا؏

" × × × کتبات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اشوک راہبانہ پرہیزگاری کو شاہانہ دانائی کے ساتھ آمیز کر دینے کا متمنّی تھا اور اپنی سمجھ کے مطابق ہندوستان میں "حق کی سلطنت" قائم کرنی چاہتا تھا۔ مگر یہ حق کی ایسی سلطنت تھی جس میں خدا کا نام تک نہ تھا اور اس کی بجائے لوگوں کو حق کے راستے پر سلطنت چلاتی تھی × × × × [1]"

بیویاں اور اولاد۔

اشوک کی دو بیویاں اور کئی بچّے تھے مگر ان کے متعلق صرف غیر معتبر افسانے باقی رہ گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس اقبال مند راجہ کے بعد اس کے کسی بیٹے کے تخت نشین ہونے کی نوبت نہیں آئی بلکہ اس کے دو پوتے دسرتھ اور سامپتی تخت کے وارث ہوئے اور سلطنت مگدھ اشوک کے مرتے ہی کمزور اور کئی حصوں میں منقسم ہوگئی۔ اشوک کی وفات کا سال ۲۳۲ء ق م کو قرار دیا گیا ہے اور اس کے بعد موریا خاندان کے اور چھ بادشاہوں کا پتہ چلتا ہے جو ۱۸۵ء ق م تک مگدھ پر فرماں روائی کرتے رہے اگرچہ ان کی سلطنت صرف قریب کے علاقوں تک محدود رہ گئی تھی۔

موریا خاندان کا خاتمہ

موریا خاندان کے زوال کے اسباب و واقعات کا مفصّل حال معلوم نہیں۔ لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ

[1] منقول از" اسمتھ۔ صفحہ ۱۹۰"

اس میں برہمنوں کی عداوت کو بہت کچھ دخل تھا۔ اشوک کے سخت قوانین سے لوگوں میں بد دلی پیدا کر دینا اور اس بد دلی سے فائدہ اُٹھانا کچھ بعید از قیاس نہیں ہے۔ بایں ہمہ سلطنت کو اصلی نقصان بیرونی حریفوں سے پہنچا اور دوسری صدی (ق م) کے اواخر میں کلنگ اور آندھر خاندان کے راجہ مگدھ کی اطاعت سے آزاد ہو گئے۔ موریا خاندان کے آخری فرماں روا کو اس کے سپہ سالار پُشیہ متر نے دغا سے قتل کر ڈالا اور خود بادشاہ بن کر نئے خاندانِ شاہی کا بانی ہُوا *(۱۸۵ ق م) اشوک و چندر گپت کی اولاد میں بعض خاندان چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے رئیس رہ گئے تھے اور ان کے نام کہیں کہیں ساتویں آٹھویں صدی عیسوی تک کے کتبوں میں موجود ہیں لیکن انہیں کبھی اتنا عروج حاصل نہیں ہوا کہ اپنے نامور خاندان کی عظمت کو دوبارہ تازہ کر دیتے *

باب ہفتم

پہلی فصل۔ سنگ، (کانو) اور آندھر خاندان

پشی متر عل۱ اور اس کی اولاد میں جتنے بادشاہ مگدھ کے حکمراں ہوئے، وہ سنگ (سنگا Sanga) خاندان سے منسوب کئے جاتے ہیں۔ مگر ان میں سب سے عرصہ تک اور کامیابی کے ساتھ پشی متر ہی نے حکومت کی اور معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب کے سوا تمام شمالی ہند کا علاقہ اس کے زیر نگیں آگیا تھا۔ اس راجہ کے آخری عہد حکومت میں کابل کے یونانی نژاد بادشاہ مناندر نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ اور سندھ و گجرات، پنجاب و راجپوتانہ فتح کر کے جنوبی اودھ تک بڑھ آیا۔ (قیاساً ۱۵۰ ق م) ان یونانی یا نیم یونانی اور ایرانی بادشاہوں کا حال آگے آئے گا جو دوسری صدی قبل مسیح علیہ السلام سے تیسری صدی عیسوی پشی متر

عل۱ اس خاندان کے بعض ناموں کا آخری جُز ”متر“ دلالت کرتا ہے کہ غالباً یہ لوگ متر یعنے سورج دیوتا کے پرستار اور ایرانی نسل سے تھے۔ اس بات کی اور شہادتیں بھی موجود ہیں کہ ہندوستان کے قدیم راجہ اہل ایران کے قدردان تھے اور بعض ایرانی یہاں کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوئے۔ پس کیا عجب ہے کہ سپہ سالار پشی متر یا پُشیامتر بھی کوئی ایرانی نژاد سردار ہو۔

تک ہند کے بعض حصوں پر حکومت کرتے رہے۔ اس جگہ سلسلۂ بیان درست رکھنے کے لئے اتنا لکھنا کافی ہے کہ کہ پشی متر نے بہ مشکل مناندر کا حملہ روکا اور آخر حملہ آور اپنے شمالی مستقر کی جانب ہٹ گیا۔ اس خطرناک دشمن سے نجات حاصل کرنے کے بعد پشی متر نے اشومدھ کا جشن منانے کی تیاریاں کیں۔ اس کی نسبت خیال جاتا تھا کہ دنیا کا سب سے طاقتور بادشاہ ہی یہ رسم ادا کر سکتا ہے اور اس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ ایک عمدہ نسل کے گھوڑے کو سال بھر کے واسطے آزاد چھوڑ دیتے تھے اور خود راجہ یا اُس کا کوئی نائب فوج لئے گھوڑے کے پیچھے پیچھے جاتا تھا کہ جس غیر مُلک میں وہ جائے وہاں کے حکمرانوں کو زیر کرے۔ اسی طرح سال بھر تک اگر کامیابی ہوی تو پھر وہ گھوڑا اور مغلوب فرماں روا دھوم دھام کے ساتھ پائے تخت میں لائے جاتے تھے اور وہاں فتحمند راجہ جشنِ عظیم برپا کرتا جس میں اُس گھوڑے کی قربانی کی جاتی تھی۔

پشی متر نے اس غرض کے لئے جو گھوڑا چھوڑا تھا اس کے ساتھ اپنے پوتے بسو متر کو روانہ کیا تھا اور اسے صرف راجپوتانے کے مشرقی حصوں میں ایک لڑائی غالباً اُن سرداروں سے لڑنی پڑی جو مناندر کے بعد اس علاقے پر قابض ہو گئے تھے۔

*

غرض پشی متر کی آرزو پوری ہوگئی اور اُس نے دھوم دھام کے ساتھ اشومدھ کی رسم ادا کی ؛

برہمنوں کا فروغ

مگر اس واقعے سے پشی متر کا سب سے طاقتور ہونا ثابت ہو یا نہ ہو، ایک بات کا ضرور سراغ لگتا ہے کہ اُس کے عہد میں برہمنوں کو دوبارہ فروغ ہوتا جاتا تھا کیونکہ اُنہی کے عقیدے میں اس قسم کی قربانیاں اُن دنوں جائز تھیں ؛ بعض اور شہادتوں سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ پشی متر نہ صرف قدیم برہمنی مَت کا دل دادہ بلکہ بودھ مت کا سخت مخالف تھا اور اس نے ان پر ایسے ایسے ظلم کئے کہ بہت سے بِھکشو مگدھ سے بھاگ کر پنجاب میں چلے آئے ؛

پشی متر نے غالباً ۱۴۹ء ق م میں وفات پائی اور اس کا بیٹا اگنی متر وارث تخت ہوا۔ مگر اس کے اور اس خاندان کے باقی پانچ راجاؤں کے نام ہی نام باقی ہیں اور قتل و خون کی بعض سازشوں کے سوا اس عہد کے کسی تاریخی واقعے کا پتہ نہیں چلتا۔ اسی قسم کی ایک سازش میں خاندانِ سنگ کے آخری فرماں روا کی جان گئی اور حکومت اس کے وزیر بسودیو (Vasu Deva) کے خاندان میں منتقل ہوگئی (۷۳ء ق م) جسے کانو یا کانوَاین کے نام سے موسوم کرتے ہیں ؛

کانو خاندان

مگر یہ خاندان جس کے چار راجہ صرف ۴۵ سال تک حکومت کرتے رہے تاریخ میں کوئی شہرت نہیں رکھتا۔

اس کے آغاز کے متعلق تو اتنا معلوم ہے کہ بسو دیو نے سنگ خاندان کے آخری راجہ کو قتل کر کے بادشاہی پر قبضہ کر لیا اور یا اس کے خاتمے کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس خاندان کے چوتھے راجہ کو دکن کے ایک (آندھری یا سات وائن خاندان کے) فرماں روا نے (شاید ۲۷ھ ق م میں) قتل کر دیا۔ ورنہ بیچ کے واقعات کا کچھ پتہ نہیں چلتا اور پرانوں کی بعض روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس واقعے سے کہیں پہلے مگدھ کے یہ راجہ اپنی خود مختاری کھو کر آندھروں کے باج گزار بن چکے تھے۔

آندھر خاندان کا ابتدائی حال

مذکورۂ بالا روایت کو جدید اہل تحقیق تسلیم نہیں کرتے لیکن یہ امر مسلّم ہے کہ آندھر خاندان کی عرصۂ دراز سے دکن میں حکومت قائم تھی اور مگاس تھنیز یونانی کے زمانے میں یہ ریاست سلطنت مگدھ کے بعد ہند میں سب سے طاقتور مانی جاتی تھی۔ یہ خاندان دراوڑی نسل سے تھا اور اس قدیم زمانے میں گوداوری اور کرشنا کے دہانوں کے درمیان کا وُہ ملک (یعنی تلنگانہ) اس کا خاص علاقہ سمجھا جاتا تھا' جہاں اب بھی سب سے زیادہ دراوڑی زبانوں کا رواج ہے[1]۔ اس ریاست کا قدیم پائے تخت "سری کاکولم" نامی شہر کو

[1] وی اسمتھ۔ صفحہ ۲۰۶۔ مگر ایک ہندو محقق مسٹر اینگر لکھتے ہیں کہ آندھر خاندان کے راجہ تلنگی زبان نہیں بولتے تھے۔ (رسالہ انڈین اینٹی کوئری۔ نومبر ۱۹۱۳ء)

بتایا گیا ہے جو کرشنا ندّی کے کنارے آباد تھا؛

مگاس تھنیز کی تحریریں دیکھ کر اس میں تو شبہ نہیں رہتا کہ یہ ریاست ان دنوں (یعنی چوتھی صدی ق م تک) خود مختار تھی لیکن اس کے ستر اسی برس بعد اشوک نے اپنے بعض کتبات میں اس کا ذکر اِس طرح کیا ہے کہ گویا وہ سلطنت مگدھ کی باج گزار ہوگئی تھی۔ پس معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ یہاں کے راجاؤں کی اندرونی خود مختاری میں زیادہ فرق نہیں آیا تاہم وہ چندرگپت یا اس کے بیٹے بندُسار کے عہد میں مگدھ کی سیادت تسلیم کرنے لگے تھے اور عہد اشوک تک ان کی یہی حیثیت رہی؛ مگر اس اقبال مند راجہ نے وفات پائی تو جہاں سلطنت کے دُور دست صوبے (خاص کر ریاست کلنگ) مگدھ کی اطاعت سے آزاد ہوے وہاں آندھروں نے بھی اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا؛ بلکہ عجب نہیں کہ اشوک ہی کے آخری زمانے میں وہ اس کی اطاعت سے آزاد ہو گئے ہوں کیونکہ ان کے راجہ سموکا کی حکومت کا یہی زمانہ ہے اور وہ غالباً اپنی ریاست کا خود مختار بادشاہ تھا اور اسی کے جانشین راجہ کرشنا (یا کنہا) نے مغرب میں ساحل سمندر کے قریب تک تمام علاقہ فتح کر کے اپنی ریاست میں شامل کر لیا تھا؛

غیر ملکی قبائل سے لڑائیاں

یہ تیسری صدی ق م کے واقعات ہیں اور ان کے بعد تقریباً دو صدی تک آندھروں کے حالات کا کچھ پتہ

نہیں چلتا۔ ان کے تمام راجاؤں کے نام کی ایک لمبی فہرست ضرور مرتب کرلی گئی ہے لیکن ان میں بھی بہت سے نام مشتبہ اور تاریخی واقعات بالکل مفقود ہیں۔ البتہ دو صدی بعد جب اس خاندان کے کسی راجہ نے مگدھ میں کانو خاندان کا خاتمہ کیا (۲۸ ق م) اور اس کے سو برس بعد ان کی غیر ملکی قبائل سے لڑائیاں شروع ہوئیں تو پھر بعض واقعات تاریخ کی روشنی میں آئے ؎

بکٹریا (باختر) پارتھیہ (کہستان یا خراسان) اور آخر میں سیتھیہ (یا ترکستان) کے بادشاہوں کے ہندوستان پر حملوں اور تسلّط کا حال ہم کسی قدر تفصیل سے آئندہ پڑھیں گے۔ مناندر کے وقت میں بلکہ اس سے بھی کچھ پہلے اِن غیر ملکی اقوام کی ہند میں آمد شروع ہوگئی تھی اور وہ موجودہ گجرات، مغربی مالوہ اور احاطۂ بمبئی کے بعض حصوں میں آباد ہونے لگے تھے اور پہلی صدی عیسوی میں آندھروں کی انہی کے حکمرانوں سے لڑائیاں ہوئیں۔ یہ حکمران "ست راپ" کہلاتے تھے (یہ صوبہ دار کے معنی میں قدیم ایرانی اصطلاح ہے) اور غالباً اوّل اوّل پارتھیہ پھر سیتھیہ کے اور آخر میں کچھ عرصہ تک کشان خاندان کے بادشاہوں سے ان کا محکومانہ تعلق تھا۔ انہی کا (جنوبی ممالک میں) دوسرا ست راپ جس کے حالات ہم تک پہنچے ہیں، نہاپان (یا نہپان) تھا۔ پہلی صدی عیسوی کے اواخر میں جنوبی راجپوتانے سے ناسک و پونا تک اور شمال مغرب میں گجرات کا

علاقہ اسی نہاپان کی قلمرو میں داخل تھا اور آندھر خاندان کے تیئسویں[۲۳] راجہ گوتمی پتر بل باسے کر Gautamiputra Vilivayukura کی قوت آزمائیاں اسی کے ساتھ شروع ہوئیں؛ یہ دکنی راجہ ہندوؤں کا ایک قومی سورما مانا جاتا ہے اور اپنے عہد میں "غیر ملکی مذاہب کی بیخ کنی کر دینے کا مدعی تھا۔ مگر معلوم ہوتا ہے اُسے نہاپان کی زندگی میں کوئی نمایاں غلبہ حاصل نہ ہو سکا البتہ جب وہ مرگیا تو اس کے جانشین راجہ بل باسے کر کے حملوں کی تاب نہ لائے اور یہ جنوبی علاقہ (مہاراشٹر) ست راپوں کے قبضے سے نکل کر آندھروں کی سلطنت میں شامل ہو گیا؛ (سنہ ۱۲۶ء)

آندھر خاندان کا خاتمہ

دکن کے شمالی ممالک، یعنی مالوے میں ست راپوں کا ایک اور خاندان حکومت کرتا تھا اور جنوبی حریفوں کے مغلوب ہونے کے بعد آندھروں کی اُن سے لڑائیاں شروع ہوگئیں۔ اِن میں بل باسے کر کے جانشین کو ناکامی نصیب ہوی اور وہ علاقہ جو نہاپان کے ورثہ سے چھینا تھا، ہاتھ سے نکل گیا؛ شمال کے اس حریف غالب کا نام رُدر دامن (اوّل) ہے اور وہ ست راپوں کے شمالی خاندان کا تیسرا راجہ یا فرماں روا تھا۔ مغربی ہند کے ان ست راپوں کا پائے تخت اُجّین میں تھا اور اس وقت (دوسری صدی عیسوی) وہ شمال مغربی ہند کے سیتھی یا کشان بادشاہوں کے باج گزار تھے۔ ان کا کسی قدر تفصیلی حال ہم اگلی فصل میں پڑھیں گے

یہاں صرف آندھر خاندان کے حالات لکھنے مقصود ہیں جن کے ستائیسویں راجہ ججن سری (Yajna Sri) نے مغربی ست راپوں سے دوبارہ جنگ چھیڑی اور غالباً بعض مغربی اضلاع چھین لئے۔ سکّوں اور کتبات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عرصہ دراز تک (از ۱۷۳ء تا ۲۰۲ء) حکمراں رہا اور آندھر خاندان کا آخری اقبال مند راجہ ہوا ہے کیونکہ اس کے بعد ان راجاؤں کی حکومت میں زوال آگیا اور ساڑھے چار صدی سے زیادہ عرصہ تک فرماں روائی کرنے کے بعد ان کے خاندان کا چراغ گل ہوگیا۔ انتزاعِ حکومت کے اسباب و واقعات بالکل تاریکی میں ہیں قیاساً اندرونی فساد کو ان کے زوال کا سبب مانا جائے یا بیرونی دشمنوں کے حملوں کو، یقینی طور پر جو کچھ کہہ سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ ۲۲۶ء سے اس خاندان کا نام گم ہے اور ان کے ملک میں آندھروں کے بجائے بیرونی اقوام کے چھوٹے چھوٹے سردار حکومت کرتے نظر آتے ہیں۔

دوسری فصل۔ ہند کے باختری پارتھی اور سیتھی حکمراں

باختر و پارتھیہ کی خود مختاری

جس زمانے میں اقبال مند اشوک فرصت و اطمینان سے اپنے اخلاقی قوانین کی ترویج میں مصروف تھا، اس کے

ہمسائے میں سخت خونریزی اور انقلابات ہو رہے تھے۔ ہماری مراد سلطنت ایران سے ہے جہاں ان دنوں سکندر کے سپہ سالار سلیوکوس کا پوتا وارث تخت ہوا تھا۔ اس بادشاہ (انتیاکوس) میں جو فرط غرور سے اپنے تئیں "خداوند" (تھیوس) کہواتا اور اپنی پرستش کراتا تھا، بادشاہی کی معمولی قابلیت بھی نہ تھی۔ اور اسی کے زمانے میں صوبہ بکٹریا اور پارتھیہ نے خود مختاری کا علم بلند کیا۔ بکٹریا کا ایشیائی اور اصلی نام باختر ہے یہ قدیم ایران کا سب سے زرخیز اور متمدن علاقہ تھا جس میں روایت عام کی بہ موجب ایک ہزار بستیاں تھیں۔ برخلاف اس کے پارتھیہ وہ صحرائی اور کوہستانی ملک ہے جس میں موجودہ خراسان سمرقند اور ہرات کے اضلاع داخل تھے، اور آسانی کے لئے ہم اسے "خراسان" کے جدید نام سے بھی یاد کر سکتے ہیں۔ اسی قوم کی زبان "پارتھوی" بعد میں پہلوی کہلائی خود یہ لوگ فارس میں "پہلوان" کہلاتے تھے مگر فردوسی نے اس لفظ کو بہادر یا جنگ جُو کے معنی میں اتنا عام کر دیا کہ اب اُس کی اصلیت نگاہ سے مخفی ہوگئی ہے۔ غرض ان مختلف النوع صوبوں میں ایک ہی وقت بغاوت ہوی (تقریباً ۲۵۰ ق م) اور دونوں شاہانِ سلیوکوسی کے تسلّط سے آزاد ہو گئے۔ مگر اس بات کو یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ باختر میں محض وہاں کا یونانی صوبہ دار موقع پاکر منحرف ہوگیا تھا اور پارتھیہ کے جنگ جو شہسوار اشکان کے جھنڈے کے نیچے اس لئے

جمع ہوئے تھے کہ غیر ملکی حکومت کا جوا اپنے کندھوں سے اتار کے پھینک دیں۔

باختر کے یونانی بادشاہ

اس طرح ملک باختر میں یونانی نسل کے بادشاہوں کی ایک علیحدہ سلطنت قائم ہوگئی (سنہ ۲۵۰ ق م) اور کوئی سواسو برس تک ان کے افراد باختر، کابل اور نیز ہندوستان کے بعض اقطاع پر حکومت کرتے رہے۔ یہی آخری تعلق ہے جس کی وجہ سے ان کے حالات اس کتاب میں ہمیں لکھنے پڑے اگرچہ تاریخی اسناد میسر نہ آنے کے باعث ان میں سے بعض باتیں قیاسی ہیں۔ اتنا یقینی ہے کہ ان کے ایام خود مختاری میں ہند پر سب سے پہلے شام کے یونانی بادشاہ انتیاکوس اعظم نے فوج کشی کی تھی مگر غالباً افغانستان سے آگے بڑھنے کی نوبت نہ آئی اور وہ بہت جلد شام کی جانب واپس چلا گیا (سنہ ۲۰۶ ق م) واضح رہے کہ انتیاکوس باختر کے یونانی فرماں روا کا حلیف اور رشتہ دار تھا اور شاید اسی کی امداد اور تحریک سے اُس نے یہ جرأت کی ورنہ خود اس کے ملک (شام) سے ہندوستان کو براہ راست کوئی تعلق نہ تھا اور ان میں جس قدر بُعد ہے وہ ظاہر ہے۔

شمالی مغربی ہند کی فتح

انتیاکوس کے بعد باختر کے چوتھے بادشاہ دمت ریوس نے ہندوستان پر فوج کشی کی اور غالباً سنہ ۱۹۰ ق م میں کابل کے علاوہ سندھ و پنجاب کے اضلاع فتح کرلئے۔ حملہ آوروں سے ان علاقوں کو بچانے والی کوئی بڑی قوت موجود نہ تھی کیونکہ موریا

خاندان کے راجہ زوال کی آخری منزلیں طے کر رہے تھے اور عجب نہیں کہ ان بعید صوبوں سے ان کا تسلّط اُٹھ چکا ہو؛ مگر دمت ریوس کے اتنی دور تک بڑھ آنے کا نتیجہ یہ ہُوا کہ خود اس کے گھر یعنی باختر میں بعض سرداروں نے بغاوت کی اور خود مختار بن بیٹھے۔ دمت ریوس کے پاس فقط ہند کے مفتوحہ صوبے رہ گئے اور اسی لئے وہ یونانی تاریخوں میں "شاہِ ہندیاں" کے نام سے مشہور ہے؛

اُس یونانی سردار کا نام یوک راتی دیس تھا جس نے دمت ریوس کو باختر سے بے دخل کیا اور اس کی شجاعت و جنگجوئی کی بڑی شہرت تھی۔ باختر پر قابض ہونے کے بعد یہ ممکن نہ تھا کہ یوک راتی دیس اپنے پہلے آقا (دمت ریوس) کو ہندوستان میں چین سے بیٹھنے دے۔ اس نے یہاں کے مقبوضات کا دعویٰ کیا اور عرصے تک جد و جہد کرنے کے بعد آخر کار ان علاقوں کو بھی چھین لیا۔ یہ شاید ۱۶۵ء ق م کا واقعہ ہے؛

یوک راتی دیس کو خود اس کے بے رحم بیٹے نے قتل کرا دیا اور پھر اپنے بھائیوں سے خانہ جنگی میں مصروف ہوگیا۔ اس واقعہ نے باختر کی نئی سلطنت میں سخت انتشار و فساد برپا کر دیئے۔ چنانچہ ہندوستان کے شمال مغربی صوبے سے اُس زمانے کے بہت سے سکّے دستیاب ہوے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس بدعملی میں بیسیوں یونانی سردار بادشاہی کے

دعویدار تھے اور جس کا جہاں زور چلتا تھا وہاں کا خود مختار حاکم بن بیٹھتا تھا؛

مناندر مدّعیان حکومت کے اس انبوہ میں ناموری کا مستحق اگر کوئی ہے تو وہ مناندر ہے جو غالباً یوک راتی دیس کا رشتہ دار اور کابل کا بادشاہ تھا۔ ٹھیک ٹھیک سین کا تو پتہ نہیں چلتا مگر اتنا ثابت ہے کہ وہ دوسری صدی ق م کے آخر اور پہلی صدی کے آغاز میں فرماں روائی کرتا تھا۔ ونسنٹ اسمتھ کے قول کے بہ موجب ۱۵۵ ق م میں اس نے ہندوستان پر وہ حملہ کیا جس کا مجمل ذکر ہم پہلے پڑھ آئے ہیں مگر محققین کا ایک اور گروہ اس حملہ کو پندرہ بیس برس بعد کا واقعہ سمجھتا ہے؛ بہر حال اس میں شبہ نہیں کہ یہ حملہ نہایت کامیاب ہوا اور سندھ و گجرات کو فتح کر کے مناندر نے قلعہ مدھمیکا اور ساکے تم کا محاصرہ کرلیا (پہلا قلعہ آج کل ناگری کے نام سے چتوڑ کے قریب موجود ہے اور دوسرا جنوبی اودھ میں واقع تھا) پھر مناندر "ایساموس ندی تک بڑھا" یعنے شاید خاص پائے تخت پاٹلی پترا تک پہنچ گیا تھا کیونکہ "ایسا موس" سے غالباً دریائے سون مراد ہے جسے یونانیوں نے اس طرح بگاڑا ہے کہ اب اس کے اصلی نام کا پتہ نہیں چلتا؛ لیکن ایسے شخص کا، جس کے گھر میں بیسیوں رقیب و مفسد موجود ہوں

۱۔ انسائی کلو پیڈیا۔ جلد ۱۸ صفحہ ۱۱۰

زیادہ عرصہ تک وطن سے باہر رہنا مخدوش تھا، مناندر کو بھی خانگی تنازعات کی وجہ سے واپس ہٹنا پڑا اور اس کی پسپائی میں ممکن ہے کہ پشیہ متر کی جنگی کوششوں کو بھی کچھ دخل ہو۔

مگر مناندر کی شہرت کا ایک اور قوی سبب پالی زبان کی مشہور کتاب "ملندا پان ہو" ہوی جس کا حال میں انگریزی ترجمہ بھی چھپ گیا ہے۔ اس میں مناندر کو "ملندا" کے نام سے یاد کیا گیا ہے اور اس کی زبان سے بودھ مت کے متعلق بہت سے سوالات کرائے ہیں۔ اس کا مخاطب بودھ مت کا بھکشو "ناگ سین" ہے اور بودھوں کا قول ہے کہ اس بھکشو نے آخرکار مناندر کو قائل کر دیا اور وہ اسی مذہب کا پیرو بن گیا تھا۔ یہ روایت صحیح ہو یا غلط اس میں شک نہیں کہ مناندر منصف مزاج اور اپنی رعایا میں بہت ہر دل عزیز بادشاہ تھا اور اس کے بعد گو یونانی نسل و نام کے سردار شمال مغربی ہند کے علاقے میں کہیں کہیں فرماں روائی کرتے رہے لیکن انہیں کوئی خاص قوت حاصل نہ ہوی اور ان میں سے اکثر شاہانِ پارتھیہ یا سیتھی اقوام کے باج گزار بن گئے۔ کیونکہ پہلی صدی ق م کے شروع ہونے سے پہلے (سنہ ۱۲۳ ق م کے قریب) باختر کی یونانی سلطنت کا چراغ گل ہو گیا تھا اور اب وہاں سیتھی حملہ آور قابض تھے۔

شاہان پارتھیہ

یونانی نسل کے باختری بادشاہوں کی خانہ جنگی اور زوال کا زمانہ، پارتھیہ کی نئی حکومت کے فروغ و ترقی کا زمانہ تھا۔ افسوس ہے کہ ہماری عربی، فارسی تاریخوں میں ان پارتھی بادشاہوں کا بہت کم ذکر ہے اور سکندر اعظم کے بعد ساسانیوں تک کے تمام زمانے کو "عہد ملوکِ طوائف" کہہ کے ٹال دیا ہے جن میں "اشکانیوں" کو کسی قدر امتیاز حاصل ہوا۔ اصل یہ ہے کہ اشکانی بادشاہوں نے اپنے صوبہ داروں کو بہت کچھ آزادی دے رکھی تھی اور وہ اپنے اپنے مقام کے خود مختار فرماں روا معلوم ہوتے تھے ورنہ ساڑھے چار صدی سے بھی کچھ زیادہ عرصے تک ایران کی اصلی شاہنشاہی اسی خاندان میں رہی اور بعض بڑے نامور فرماں روا گزرے جنھوں نے عراق عرب تک تمام علاقہ یونانی تسلّط سے آزاد کیا اور ہندوستان کے بعض حصے فتح کئے۔ ہندوستان کے ان صوبوں پر پارتھی صوبہ دار (یاست راپ) مقرر اور ایک حد تک خود مختار تھے۔ اور ہماری تاریخ کا انہی نیم خود مختار صوبہ داروں سے تعلق ہے۔ مگر ان کے حالات کا مطالعہ کرتے وقت یہ ذہن نشین رہنا چاہیئے کہ جو کچھ ہمیں معلوم ہوسکا اس کے ماخذ ناقص ہیں۔ شاہان پارتھیہ ہی کی کوئی مسلسل اور معتبر تاریخ موجود نہیں تو ان کے ہندوستانی ست راپوں کی کون لکھتا۔ پس بہت سی باتیں قیاسی اور مختلف فیہ ہیں۔

ہند کے پارتھی حکمران

معلوم ہوتا ہے شاہانِ پارتھیہ نے شمال مغربی ہند میں

دو صوبے بنائے تھے : ایک میں ہرات و سیستان اور شاید بلوچستان کا ملک شامل تھا اور دوسرے میں شمال مغربی پنجاب یا قدیم ٹکسیلا کا علاقہ۔ ہمیں زیادہ تر اس دوسرے صوبے سے بحث کرنی چاہیئے اور سلسلہ بیان کو ازیس کے زمانے سے شروع کرنا چاہیئے جسے شاہ متراڈیٹیس (ثانی) نے سیستان سے بدل کر ٹکسیلا بھیج دیا تھا (۹۰؁ ق م) ازیس نے پارتھیہ کے باج گزار بادشاہ کی حیثیت سے مغربی پنجاب میں بہت دن تک فرماں روائی کی مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں وہ خود مختار ہوگیا تھا۔ اس کے بعد کوئی سو برس تک اس کا بیٹا اور پوتا حکومت کرتے رہے اور غالباً ۲۰؁ء میں ان سے گندوفاریس یا ہندوفاریس نے حکومت لے لی۔ اس شخص کے خاندان اور سلطنت پارتھیہ سے تعلقات کا صحیح علم نہیں مگر اس قدر معلوم ہے کہ مغربی پنجاب کے علاوہ سندھ و ہرات پر بھی اس کا قبضہ تھا اور وہ تقریباً چالیس سال تک فرماں روا رہا۔ اس کے متعلق قدیم عیسائیوں میں یہ روایت مشہور تھی کہ جب مسیح علیہ السلام کے حواریوں نے دین مسیح کی تبلیغ کا ارادہ کیا تو سلطنت پارتھیہ طامس ولی کے حصّے میں آئی چنانچہ وہ گندوفاریس کے دربار میں بھی پہنچے اور وہیں کہیں کابل کے علاقے میں شہید ہوے۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ جنوبی ہند میں آکے شہید ہوے اور مدراس کے قریب میلاپور میں ان کے نام کی ایک درگاہ بھی بنی

ہوی ہے ؛

گنڈو فاریس کے بعد اس کا ملک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا اور ان میں سے صرف پنجاب کا حال معلوم ہے کہ اسے پہلی صدی کے وسط میں کُشان خاندان کے بادشاہوں نے فتح کر کے اپنی سلطنت میں ملا لیا، اور غالباً سندھ و ہرات پر بھی یہی گزری؛ اس میں شک نہیں کہ جنوبی سندھ میں بہت بعد تک پارتھی رئیسوں کا فرماں روا ہونا ثابت ہے مگر یہ بہت محدود ریاستوں کے حاکم تھے اور انہی کی طرح شمالی علاقوں میں یونانی بھی پہلی صدی عیسوی کے شروع تک کہیں کہیں حکومت کرتے نظر آتے ہیں ؛

سیتھی اقوام کی آمد

جیسا کہ ہم اشارہ کر آئے ہیں پہلی صدی عیسوی سے شمال مغربی ہند پر قبضہ سیتھی یا ترکمانی اقوام کے حملہ آوروں کو حاصل ہو گیا تھا اور ان میں سک یا سکا (Saka) پہلی قوم ہے جو سیستان و سندھ سے گزر کر غالباً گجرات کے علاقے میں پھیل گئی تھی (دوسری صدی ق م) ان کو اپنے وطن یعنی وادئ جیحون سے خانہ بدوش ترکمانوں کے ایک اور بڑے گروہ نے بے دخل کر دیا تھا جو یوچی Yuehchi کے چینی نام سے مشہور ہے - یہ قوم اتنی بڑی تعداد میں شمال مشرق سے آئی تھی کہ نہ انہیں جیحوں کے قبائل روک سکے نہ باختر و پارتھیہ کے وہ بادشاہ جن کی نئی سلطنتوں کے حالات ہم اوپر پڑھ آئے ہیں؛ اور گو پارتھیہ میں نو وارد

یوچیوں کے قدم جمنے کی نوبت نہیں آئی لیکن سغد و باختر سے یونانی حکومت کا نام و نشان مٹ گیا اور یہ خانہ بدوش وادئی سیحوں کی زرخیز سرزمین کے مالک بن گئے۔ یہاں انہوں نے مستقل سکونت اختیار کر لی اور اُن کے بڑے بڑے گروہ پانچ ریاستوں میں مُنقسم ہوئے جو پہلی صدی عیسوی کے آغاز تک موجود تھیں۔

شاید ۴۵ء میں انہی گروہوں میں سے ایک گروہ کُشان یا کُشن (Kushan) کے سردار نے پانچوں ریاستوں پر قبضہ کر کے دوبارہ قوم یوچی کو ایک متحد سلطنت میں شیرازہ بند کر لیا اور کوہستان ہندوکش کو اتر کے ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ کتبوں میں اس بادشاہ کا نام "کجلاکر کادفیسں" کندہ ہے مگر آسانی کی غرض سے اہل یورپ کدفیسں کہنے لگے ہیں۔ ملک افغانستان کی فتح اسی سے منسوب کی جاتی ہے اور دریائے سندھ کے مغرب میں یونانی یا پارتھی نسل کے رئیسوں کی جو ریاستیں باقی تھیں ان کا خاتمہ بھی اسی بادشاہ نے کیا، گو پنجاب اور ملک سندھ میں غالباً وہ کچھ اور مدت تک قائم رہیں۔

کدفیسں دوم — یوچی قوم کے اس نامور بادشاہ کے بعد اس کا بیٹا کدفیسں دوم فرماں روا ہوا (۸۵ء یا ۸۵ء) اور وہ اپنے باپ سے بھی زیادہ بلند حوصلہ اور اقبال مند بادشاہ گزرا ہے۔ افسوس ہے کہ اس زمانے کے تاریخی واقعات پر تاریکی چھائی

ہوی ہے اور قیاس آرائی کے لئے صرف پرانے سکے ملتے ہیں جن کی بنا پر بعض اہل الرائے کا خیال ہے کہ کدفیس دوم نے نہ صرف پنجاب بلکہ وادئی گنگا میں بنارس تک اور جنوب میں نربدا تک تمام شمالی ہند کو فتح کر لیا تھا۔ اس خیال کو تقویت اس وجہ سے پہنچتی ہے کہ اُن دنوں شمالی ہندوستان میں کسی ایسی قوی ریاست کا پتہ نہیں چلتا جو بیرونی دشمنوں کو روک لیتی۔ لہذا کدفیس کو اگر دوسری طرف سے اطمینان تھا اور اس کا باپ اندرونی طور پر سلطنت کو مستحکم اور کشان خاندان کے ماتحت قوم یوچی کو متحد کر گیا تھا، تو یہ بات خلافِ عقل نہیں کہ اس کے جنگجو وارث کو اپنے کمزور ہمسائوں کے زرخیز علاقے لینے کا لالچ پیدا ہوا ہو اور جہاں تک آگے بڑھ سکتا تھا وہاں تک اس بے نظیر زمین پر قابض ہوگیا ہو۔ کیونکہ اس میں تو کچھ شک نہیں معلوم ہوتا ہے کہ کدفیس دوم کو ایسی فتوحات کی بہت فرصت حاصل تھی اور وہ تیس پینتیس برس تک حکمراں رہا۔

مغربی ست راپ

کدفیس دوم کی یورش کے وقت شمالی ہندوستان میں کئی جگہ غیر ملکی ست راپوں کی حکومت تھی۔ ان میں سے بعض کے نام پارتھی ہیں لیکن وہ بالعموم سک یا سکا قوم کے لوگ تھے اور اس قوم کی نسبت ہم پہلے پڑھ چکے ہیں کہ یوچیوں نے اسے وادی سیحون سے نکال دیا تھا اور اس کے بعض گروہ سندھ کے راستے گجرات و مالوے میں

داخل ہو گئے تھے۔ اہل تحقیق کا خیال ہے کہ انہی کی مغربی ہند میں وہ حکومتیں قائم ہوئیں جن کی آندھر خاندان کے راجاؤں سے جنگ و جدال کا حال ہم پچھلی فصل میں پڑھ آئے ہیں۔ لیکن اس قوم کا اصلی مستقر ہند کے باہر ملک سیستان ہی میں رہا بلکہ خود یہ نام ("سکستانی" پھر "سکستان" سے سیستان) انہیں کی یادگار ہے۔ ہندوستان میں اُن کی رسائی دوسری صدی ق م کے آخری سنین میں ہوی تھی مگر ان کے مغربی صوبہ داروں کا ذکر دو صدی بعد سے شروع ہوتا ہے جب کہ پہلی صدی عیسوی کے اواخر میں اجّین کا فرماں روا چشتن (Chashtana) اور مہاراشٹر یا جنوبی صوبے کا پہلا حاکم بھومکا تھا۔ ان کا پتہ صرف ان کے سکّوں سے چلتا ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ شاید اس وقت تک یہ ستّ راپ حکومت سیستان کے محض ماتحت صوبہ دار تھے اور کدفیسیس دوم کے زمانے میں سلطنت کشان کے باج گزار بن کر اپنے نام کا سکّہ ضرب کرانے لگے ان میں سے بعض کے نام پارتھی ہیں اور اس سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ سیستان اور قوم سکا کے دیگر مقبوضات شاہانِ پارتھیہ کے زیر اثر آگئے ہوں گے اور یا ان کی ہندی نو آبادیوں میں پارتھی عنصر داخل ہوگیا ہوگا؟

بہر حال، شاہانِ کشان کے باج گزار[۱] ہونے کے باوجود

---

[۱] اوکس فورڈ ہسٹری صفحہ ۱۵۲

مالوے کے ست راپوں نے بڑا عروج پایا اور جنوبی ست راپوں کا علاقہ بھی آندھروں سے چھین کر اپنے قبضے میں لے لیا (دیکھو صفحہ ۱۱۶) یہ دوسری صدی عیسوی کا واقعہ ہے اور اس وقت تیسرا ست راپ یعنی (بانیٔ خاندان چشتن کا پوتا) رُدر دامن (اوّل) مالوے کا فرماں روا تھا؛ اس فتح نے اسے سندھ سے کوکن تک تمام مغربی ہند کا مالک بنا دیا اور اسی بنا پر اُجّین کے یہ حاکم "مغربی ست راپوں" کے نام سے تاریخ میں مشہور ہوئے؛

ان کا خاتمہ ان غیر ملکی بادشاہوں نے تین صدی تک بادشاہی کی اور سلطنت کشان میں زوال آنے کے بعد وہ بالکل خود مختار ہو گئے تھے - ان کا پایۂ تخت اجّین علم و فن اور صنعت و تجارت کا پہلے سے مرکز تھا غالباً ان ست راپوں کے عہد میں اسے اور بھی فروغ حاصل ہوا اور قرائن کہتے ہیں کہ بودھ مت کے خلاف انہوں نے برہمنوں کی حمایت اور سنسکرت علم ادب کی بھی سرپرستی کی۔مگر یہ سب قیاسات ہیں اور ان کے ناموں کے سوا اور حالات معلوم کرنے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔حتّیٰ کہ یقین کے ساتھ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی حکومت کا خاتمہ کس طرح ہوا کتاب "ہرش چرت" میں ایک عجیب روایت تحریر ہے کہ آخری ست راپ (جس کا نام ردر سنگھ Rudrasinha تھا) کسی اور شخص کی بیوی پر فریفتہ ہوا اور بھیس بدل کر پاٹلی پترا

پہنچا۔ مگدھ کے راجہ سمدرگپت کو جس کی ان ست راپوں سے جنگ ٹھنی ہوئی تھی، یہ حال کھل گیا اور اُس نے وہیں دھوکے سے اپنے دشمن کا کام تمام کر دیا۔ اور گو افسانہ نگار کی یہ روایت قابل یقین نہیں لیکن یہ واقعہ صحیح ہے کہ مغربی ست راپوں کی حکومت کا راجہ سمدرگپت نے خاتمہ کیا اور ان کا تمام علاقہ چھین کر اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ سمدرگپت کا تفصیلی حال اگلے باب میں ہماری نظر سے گزرے گا مگر یہ فتوحات اسے چوتھی صدی کے اواخر میں حاصل ہوئی تھیں اور سکّوں سے بھی ۳۸۸ء کے بعد مغربی ست راپوں کا نام ونشان غائب ہے ؛

تیسری فصل ۔ راجہ کنشک

چشتن کی مالوے میں حکومت کا زمانہ ٹھیک وہ زمانہ ہے جب کہ کدفیس دوم شمالی ہند پر فاتحانہ حملے کر رہا تھا۔ ان علاقوں میں سکا قوم کے بعض چھوٹے چھوٹے صوبہ داروں کا اس کے ہاتھوں مغلوب ہونا ثابت ہے اور یہ صوبہ دار یا تو اس کے باج گزار ہو گئے اور یا انہیں شاہانِ یوچی (یا کشان) کے مقرر کردہ صوبہ داروں کے واسطے جگہ خالی کرنی پڑی۔ چنانچہ کشمیر، وسط پنجاب اور متھرا میں یہی ہوا کہ پہلی صدی عیسوی

کے دوسرے نصف میں سکا حکمرانوں کی جگہ یوچی سردار حکومت کرنے لگے جنھیں کدفیس دوم نے مقرر کیا تھا۔ شاید انہیں سرداروں میں کَنِشک (Kanishka) بھی تھا جو یوچیوں کے ایک دوسرے گروہ میں شامل ہے اور کدفیس یا اس کے گروہ کا کوئی قریبی رشتہ دار نہ تھا[1]۔

وسعت سلطنت

اس کے سکّے جو کابل سے غازی پور تک مختلف مقامات میں ملے ہیں ظاہر کرتے ہیں کہ غالباً وہ کدفیس دوم ہی کے زمانے سے اپنے نام کا سکّہ ضرب کرانے کا اختیار رکھتا تھا اور ان دونوں کے ایک ہی وقت کے سکّوں سے اہل تحقیق میں سخت اختلاف پیدا ہوگیا ہے کہ آیا کنشک پہلے گزرا ہے یا کدفیس۔ مگر محقّقین کا اب اس بات پر اجماع ہوتا جاتا ہے کہ کَنِشک کدفیس دوم کا جانشین ہے اور ۱۲۰ئ کے قریب تمام سلطنت کشان کا بادشاہ ہوگیا تھا[2]۔ اس کی تخت نشینی اور سنین کے متعلّق اس قدر اختلافات ہیں تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ دیگر

---

[1] ان تمام واقعات کی صحت میں بہت سے شکوک اور اختلافات ہیں مگر ہم نے ونسنٹ اسمتھ کی تازہ ترین کتاب کی پیروی کی ہے ۱۲

[2] اوکسفورڈ ہسٹری صفحہ ۱۲۷۔ لیکن اُس کی تخت نشینی کدفیس دوم کی وفات کے کوئی دس برس بعد ہوی۔ اور جس طرح اس انتقال حکومت کے اسباب معلوم نہیں اُسی طرح اس بیچ کے زمانے کا بھی ہمیں کچھ علم نہیں کہ اس میں حکومت کس کے پاس رہی۔

واقعات کی صحّت کا کیا حال ہوگا؟ چنانچہ اب تک ٹھیک ٹھیک پتہ نہیں چل سکا کہ اس کی حدود سلطنت کیا تھیں۔ قیاسِ غالب یہ ہے کہ شمالی سندھ و کشمیر کو اس نے فتح کیا اور مشرق میں پاٹلی پترا تک بڑھا۔ مغربی ست راپ بھی اس کے مطیع ہوگئے تھے اور اس اعتبار سے وہ قریب قریب نصف ہندوستان کا فرماں روا تھا جس میں اس برّ اعظم کے بہترین ممالک شامل تھے؛ شمال میں موجودہ دولتِ افغانستان کا تمام علاقہ یوچیوں کے قبضے میں تھا اور کاشغر ختن اور یارقند کو کنشک نے فتح کر کے اپنی سلطنت میں ملا لیا تھا۔ یہ علاقے چین کے باج گزار تھے اور ان کی فتح میں اس قدیم سلطنت سے بھی لڑائیاں پیش آئیں کدفیس دوم چینیوں کے ہاتھ سے سخت شکست کھا چکا تھا مگر کنشک ان کے مقابلے میں کامیاب ہوا اور چند چینی سردار یرغمال میں لے کر آیا (سنہ ۱۵۲ء[1]) یہ سردار گرمیوں میں بودھ مت کی ایک خانقاہ واقع کافرستان میں رکھے جاتے تھے اور وہاں کے بھکشوؤں نے خانقاہ کی دیواروں پر ان کی تصویریں بنائی تھیں، بلکہ ساتویں صدی میں ہوئن چوئنگ یا ہیوں تسانگ سیّاح یہاں پہنچا تو اس وقت بھی ان چینی نظر بندوں کی یادگاریں موجود تھیں اور اہل خانقاہ ان کے حالات سناتے تھے؛

[1] یہ سن قیاسی ہے اور اس کی صحت کے متعلق ملاحظہ ہو اوکسفورڈ ہسٹری۔ صفحہ ۱۳۱

بودھ مت علاقہ گندھار میں پرشپور یعنی موجودہ پشاور کنشک کا پائے تخت تھا۔ وہاں اس نے بودھ مت والوں کے واسطے عالی شان مذہبی عمارات بنائی تھیں جن کے کھنڈروں سے حال میں بعض کارآمد اشیاء دستیاب ہوی ہیں۔ اس کے بودھ مت اختیار کرنے کے متعلق بہت سی روایتیں ہیں اور گو ان میں واقعات کو نہایت مبالغہ آمیز طریق پر بیان کیا گیا ہے لیکن اتنا مسلّم ہے کہ مہاراجہ اشوک کے بعد ہندوستان میں اس مذہب کا سب سے بڑا حامی اور سرپرست کشان خاندان کا یہی راجہ کنشک گزرا ہے[1] اور اسی نے بودھ مت کے بڑے بڑے علماء کی ایک مجلسِ عظیم کشمیر میں منعقد کی تھی۔ مشہور ہے کہ اس قسم کی پہلی مجلس اشوک کے ایما سے پاٹلی پتر میں ہوی اور شاید اسی کی تقلید میں کنشک کو یہ خیال آیا تھا۔ اس مجلس کو سیاسیات سے کوئی تعلق نہ تھا مگر اس کے مذہبی مباحث کا مجموعہ ("مہاوِبھاشا"[2]) علمائے تاریخ کے لئے بہت کام کی چیز ہے

[1] وہ معلوم نہیں کیا اسباب تھے کہ کنشک بودھ مت کی اتنی حمایت کرتا تھا۔ اس مذہب کی کتابوں میں جو وجوہ بیان کی گئی ہیں وہ کچھ دل کو نہیں لگتیں بلکہ ایسا نظر آتا ہے کہ مہاراجہ اشوک کے بودھ مت قبول کرنے کے متعلق جو کہانیاں مشہور تھیں گویا ان کو ذرا بدل کر کنشک سے منسوب کر دیا ہے۔ حالانکہ سکّوں سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ بادشاہ قدیم ایرانی، یونانی اور زرتشتی دیوتاؤں کے ایک عجیب مجموعے کا پرستار تھا اور معبودوں کے اسی گروہ میں اس نے بعض ہندی دیوی دیوتا بھی شامل کرلئے تھے۔" (اوکسفورڈ ہسٹری صفحہ ۱۳۱)

[2] یہ چینی زبان میں محفوظ ہے ۱۲ منہ

اگرچہ اس سے ابھی تک خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھایا گیا؛ علمائے بودھ کے ان مناظروں سے اُس تعجب انگیز انقلاب کا پتہ چلتا ہے جو بودھ مت میں چار پانچ صدی کے اندر پیدا ہوگیا تھا ضمناً لوگوں کے دماغی اور اخلاقی حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے؛

بُت پرستی اور اندرونی اختلافات

پہلا اور بہت بڑا فرق تو یہ ہے کہ بودھ مت میں اب بت پرستی کا رواج ہوگیا تھا اور بہت سے بتوں کے ساتھ خود بانیٔ مذہب کی مُورت پُجنے لگی تھی۔ تین صدی پہلے کسی بودھ عالم کو یہ خیال بھی نہ آتا ہوگا کہ اپنے رہ نما گوتم کی پرستش کرے لیکن اسی تھوڑے سے زمانے میں ہندوستان پر بیرونی حملوں نے یہ اثر ڈالا کہ بودھ مت کے پیرو گوتم منی کو خدائی صفات سے موصوف جاننے لگے۔ وہ نہ صرف اس سے اپنی مرادیں مانگتے بلکہ اس کی درگاہ تک دعا کی رسائی کے واسطے بھی اور اوتاروں (یا "بُدھ ستوؤں") کی شفاعت چاہتے تھے؛ جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا، اس انقلاب کا بڑا سبب یہ تھا کہ وحشی یا نیم وحشی حملہ آوروں نے شمال مغربی ہندوستان کو فتح کیا اور یہاں بس گئے تو گو انہوں نے بودھ مت کو اختیار کرلیا لیکن ساتھ ہی ان کے قومی عقائد و اوہام کی بھی اس مذہب میں آمیزش ہوگئی اور چونکہ وہ صاحبِ حکومت و قوت تھے لہذا قرینہ کہتا ہے کہ علمائے بودھ اس خرابی کو نہ روک سکے۔ دوسرے خود ان میں بہت سے اندرونی اختلافات اور ملحدانہ خیالات پیدا ہوگئے تھے، اور کچھ پتہ نہ چلتا تھا کہ

گوتم بدھ کی اصلی تعلیم کیا ہے؟ بلکہ انہی اختلافات اور متضاد خیالات سے گھبرا کر کنشک نے اپنے دینی معلم پارسو (Parsva) سے تحریک کی تھی کہ بودھ مت کے تمام علما کو جمع کیا جائے تاکہ بحث و مشورے کے بعد مذہب کے وہ اصول قرار دیئے جاسکیں جو مسلّم و متّفق علیہ ہوں۔ ان "پانچ سو منتخب علماء" کی محنت و عرق ریزی کا نتیجہ وہ بسیط شرح ہے جسے "مہاوِبھاشا" کہتے ہیں اور جس میں تمام اختلافات کا مفصّل بیان قلم بند کیا ہے اور اٹھارہ بڑے بڑے فرقوں کے اختلافات رفع کئے ہیں؛ بایں ہمہ بعض اصولی فرق باقی رہ گئے اور اس مذہب کے دو بڑے گروہ اب تک موجود ہیں جن میں ایک "ہینایانی" (یعنے دَور صغریٰ) یا قدیم تر عقائد کا پیرو کہلاتا ہے اور دوسرے کو "مہایانی" (یعنی دَور کبریٰ والے) کہتے ہیں؛

کنشک کی وفات اور جانشینو

کنِشک نے غالباً ۴۰ برس حکومت کی اور ۱۶۲ء میں فوت ہوا۔ اس کی موت کے متعلق ایک عجیب قصّہ مشہور ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید رعایا نے اس کی ہوسِ ملک گیری سے تنگ آکر اُسے مار ڈالا تھا؛ واقعات تاریخی کے نہ ملنے کی وجہ سے یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس بادشاہ کا جانشین کون تھا۔ لیکن قرائن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے بعد اُسی کا بیٹا ہوشک Huvishka بادشاہ ہوا جس کے بہت سے سکّے دستیاب ہوئے ہیں؛ اس کے بِست سالہ عہدِ حکومت میں سلطنت کُشان اپنے عروج پر تھی لیکن

زوال کا وقت بھی قریب آگیا تھا اور اگلے بادشاہ کے طولانی زمانۂ حکومت میں اس کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ یہ بادشاہ جس کا نام (**باس دیو** Vasudeva) ثابت کرتا ہے کہ اب یہ نووارد یوچی خالص ہندوستانی ہو گئے تھے، شاید ۱۸۲ء سے ۲۲۰ء تک فرماں روا رہا اور اس کے بعد سلطنت مختلف ریاستوں میں منقسم ہو گئی۔ اس میں شک نہیں کہ پنجاب و کابل میں کشان (یا "شاہی") خاندان کے بادشاہ چوتھی صدی کے اخیر تک حکومت کرتے رہے اور ان کا خاتمہ گورے ہونوں (White Huns) کے سیلاب نے کیا لیکن باس دیو کے بعد ان کی قوت میں ضعف آگیا تھا اور گمانِ غالب یہ ہے کہ وہ تھوڑے ہی عرصے بعد ایران کے ساسانی بادشاہوں کے خراج گزار ہو گئے تھے۔ ایران میں یہ (ساسانی) خاندان پارتھیوں کا جانشین ہوا تھا اور اس کے اولوالعزم بادشاہوں نے "عہد کیانی" کی یاد تازہ کردی تھی۔ تیسری صدی میں ان کے بادشاہ بہرام کے ہند پر حملوں کا پتہ چلتا ہے مگر تفصیلی حالات موجود نہیں اور بعد میں صرف دو واقعے مذکورہ بالا قیاس کی تائید کرتے ہیں، ایک تو یہ کہ ہرمزد ثانی کو شاہ کابل نے اپنی بیٹی بیاہ دی تھی اور دوسرے یہ کہ جب شاپور ثانی نے ۳۶۰ء میں قلعۂ دیار بکر پر رومیوں کو شکست دی تو ہندوستان کے ہاتھی اور کشان خاندان کا راجہ اس کے ساتھ تھے۔

مگر جہاں تک شمالی ہندوستان کا تعلق ہے، چوتھی صدی کے

آغاز تک اس ملک کی تاریخ بالکل معدوم ہے۔ کوئی کتبہ کوئی سکّہ ایسا نہیں ملتا جو اُس زمانے کا سراغ دے؛ اتنا کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت یہاں کوئی بڑی سلطنت نہ تھی اور ایشیائی دستور کے مطابق بہت سی خود مختار ریاستیں قائم ہوگئی ہوں گی۔ ورنہ مغربی ست راپوں کے سوا اس تمام مدّت میں شمالی ہند اور دکن کے کسی فرمانروا کا پتہ نہیں چلتا؛

ضمیمہ باب ہفتم

غیر اقوام کا اثر ہندوستان میں

ونسنٹ اسمتھ نے منو کے دھرم شاستر کی تدوین اسی (دوسری صدی ق م تا دوسری صدی عیسوی کے) زمانے سے منسوب کی ہے[1] لیکن سنسکرت علم ادب کے بعض ماہرین کے نزدیک وہ تین سو برس بعد کی کتاب ہے (انسائی کلو، ج ۲۴ ص ۱۷۵) البتہ یہ قریب قریب مسلّم ہے کہ بودھ مت کے تین مشہور مصنف (ناگارجون، اسوگوش اور بسومتر) راجہ کنشک کے عہد میں ہوئے ہیں اور چرک (Charaka) نامی طبیب بھی اس کی سرکار کا ملازم تھا جو قدیم ہندی طب کا سب سے مشہور مصنّف مانا جاتا ہے۔ بعض اہل تحقیق کا گمان ہے کہ عجب نہیں اس نے حکیم بقراط یونانی کی طبّی تصانیف سے استفادہ کیا ہو کیونکہ اُن دنوں شمال مغربی ہندوستان کی بعض ریاستوں میں جہاں یونانی نسل کے افراد حکمراں تھے، یونانی زبان کے جاننے والے ضرور موجود ہوں گے۔ لیکن یہ سب قیاسات ہیں اور ان کا

---

[1] اوکسفورڈ ہسٹری صفحہ ۱۴۳

کوئی قابل لحاظ تحریری ثبوت نہیں ملتا[1]۔

البتہ اِس زمانے کے جو مجسمے ٹکسیلا یا پشاور کے کھنڈروں سے برآمد ہوئے وہ زبانِ حال سے گواہی دیتے ہیں کہ اس فن پر یونانیوں کا بڑا اثر پڑا تھا چنانچہ گوتم بودھ کے بعض مجسمے یونانیوں کے اپالو دیوتا سے مشابہ ہیں اور بعض کی وضع زئیس دیوتا سے ملتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ پہلی صدی عیسوی کے اخیر میں جب شام اور ایشیائے کوچک پر رومیوں کا مستقل قبضہ ہوگیا اور یونانی ملوک طوائف کی خانہ جنگیوں سے نجات ملی تو وہاں یونانی علم و فن اور صنعت و حرفت کو بڑی ترقی ہوی اسی آخری دَور کے سنگ تراش تھے جن کی صنّاعی کے نمونے ایران و خراسان ہوکر ہند میں پہنچے۔ خاص کر کنشک اور اس کے بیٹے ہوشک کے عہد حکومت میں ان بیرونی کاریگروں کا اثر بہت نمایاں ہے اور ہندی سِکّوں پر بھی یونانی دیوتاوں کی تصویریں ملتی ہیں۔ سب سے عجیب بات یہ ہے کہ گو ان کُشان بادشاہوں کی زبان ایران کی قدیم بولی سے قریبی تعلّق رکھتی تھی تاہم سکّوں پر اپنے نام یا اپنی زبان کے الفاظ وہ یونانی حروف ہی میں کندہ کراتے تھے۔ اسی ضمن میں یہ لکھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ایک کتبے سے ثابت ہوا ہے کہ راجہ کنشک نے رومتہ الکُبریٰ کے بادشاہوں کا لقب (''قیصر'')

[1] اوکسفورڈ ہسٹری۔ صفحہ ۱۴۳

اختیار کر لیا تھا[1]۔

ایشیا کے اِن مغربی ملکوں کا ہند پر جو کچھ اثر پڑا اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ شاہانِ کشان اور نیز یہاں کے یونانی نژاد رئیسوں کا ترکستان و خراسان سے آئے دن سابقہ پڑتا رہتا تھا۔ مگر دُوسرا قوی سبب بیرونی تجارت کو سمجھنا چاہیئے جو اُن دنوں فروغ پر تھی۔ صحرائے شام کا قدیم شہر پامیرا ہندوستان کی تجارت کا سب سے بڑا مرکز تھا اور یہاں سے کئی راستے (ایران ہوکر) شمال مغربی ہند کو آتے تھے، بلکہ مُلک چین کا تجارتی مال بھی انہی ہندوستانی راستوں سے ایشیائے کوچک پہنچتا تھا۔

اِن برّی راستوں کے علاوہ سمندر سے بھی تجارت کا مال آتا جاتا تھا۔ بحرِ عرب سے مغربی باد برشگال یا "مونسُون" کے ساتھ ساتھ عرب تاجروں کی بادبانی کشتیاں ساحل مِلیبار پر آ پہنچتی تھیں اور دسمبر یا جنوری میں یہاں کے گرم مسالے جواہرات اور موتی لے کر یہ بحری تاجر واپس چلے جاتے تھے۔ سواحلِ عرب سے یہ مال اونٹوں پر لد کر مصر و شام کی منڈیوں میں پہنچ جاتا تھا۔ ساحل ملیبار پر کرنگ پور (یا "مزیریس") اور بکارے نامی بندرگاہیں اس بحری تجارت کا بڑا مرکز تھیں چنانچہ رُومی قیصروں کی بہت سی پرانی اشرفیاں یہاں سے دستیاب

[1] اوکسفورڈ ہسٹری - ۱۳۴ - اگرچہ اس بارے میں ابھی تک کسی قدر اختلاف ہے۔

ہوئی ہیں ؛ کورومنڈل کی جانب کور کی اور پوہار دو قدیم بندرگاہوں کا ذکر آتا ہے جہاں سے ہندوستان کا مال مصر و اطالیہ کے شہروں تک پہنچتا تھا ؛ چونکہ ادھر سمندر اپنی جگہ سے کسی قدر ہٹ گیا اس لئے وہ قدیم بندرگاہیں خشکی میں رہ گئیں اور جب بحری تجارت نہ رہی تو اُن کی وہ رونق اور آبادی بھی نہ رہی اور وہ رفتہ رفتہ ویران ہوگئیں -

ان تمام تعلقات اور اثرات کے باوجود، یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ (کشان) بادشاہ نسلاً ترکستانی اور مذہب کے اعتبار سے وسیع مشرب بُت پرست تھے جنھیں ایرانی اور یونانی اصنام کے روبرو سجدہ کرنے میں باک تھا نہ ہندوستانی دیوتاؤں کے پُوجنے میں - اُن کے لبادے اور پاؤں میں نرم چمڑے کے موزے دیکھ کر یقین ہوتا ہے کہ بیرونِ ہند سے وہ لباس کی طرز اپنے ساتھ لائے تھے کیونکہ قدیم ہندوستان میں چادر یا دھوتی کے سوا کسی لباس کے پہننے کا عام رواج نہ تھا ؛

*

باب ہشتم

پہلی فصل۔ سلطنت مگدھ کا دُوسرا دورِ فروغ

گپت خاندان کا آغاز

قدیم تاریخ ہند کی یہ "صدائے بازگشت" بھی یاد رکھنے کے لائق ہے کہ سلطنت مگدھ کو پہلی مرتبہ بھی اس وقت عروج ہوا جب اجاتسترو نے لچھوی قوم کی کسی امیرزادی سے شادی کی۔ اور دوسری مرتبہ بھی اس ریاست نے فروغ پایا تو اس کا پہلا واقعہ بلکہ شاید قوی سبب یہی تھا کہ مگدھ کے گمنام سے راجہ چندرگپت کا اسی لچھوی قوم کے خاندانِ شاہی میں پیوند ہُوا۔ یہ غیر ہندی قوم جس کے ساتھ راجگانِ ہند کا سنجوگ ایسا مبارک ثابت ہُوا، دوسری صدی عیسوی کے شروع میں ملک نیپال پر قابض ہو گئی تھی۔ مگر اس ایک واقعے کے سوا، پانچویں صدی ق م سے چوتھی صدی عیسوی تک اس کا کہیں نام سننے میں نہیں آتا۔ ممکن ہے کہ سنگ خاندان کے زوال کے وقت اُن کا دستِ تصرّف خاص پائے تخت پاٹلی پترا تک دراز ہو گیا ہو اور مگدھ کی سلطنت کے خاتمے میں ان کا بھی کچھ حصہ ہو۔ لیکن یہ سب بے بنیاد قیاسات ہیں البتہ اس میں

کوئی شک نہیں کہ انہی کے ہاں رشتہ ہو جانے سے
چندر گپت کو یہ حوصلہ ہوا تھا کہ اس نے ادھی راج یا
"شہنشاہ" ہونے کا دعوے کیا۔ اس کے سکّوں پر
اپنے نام کے ساتھ اس لچھوی بیوی کمار دیوی کا نام
بھی کندہ ہے اور کتبات میں اس کا نامور جانشین کمار دیوی
کا بیٹا ہونے پر فخر کرتا ہے۔ اور یہ دونوں باتیں مذکورہ بالا
قول کی تائید میں پیش کی جا سکتی ہیں۔

اس خاندان کا نام چندر گپت سے بھی پہلے کا ہے
لیکن اس کا (گپت نامی) دادا چھوٹی سی ریاست کا معمولی
رئیس تھا اور سلطنت کی شان چندر گپت (اوّل) ہی کے
زمانے میں پیدا ہوی۔ اسی نے گنگا جمنا کے سنگم تک
اپنا علاقہ بڑھایا اور اپنے نام کا سمت الگ جاری کیا
جس کا کئی صدی تک ہندوستان میں رواج تھا۔ اس کا
آغاز فروری ۳۲۰ء سے ہوتا ہے۔ اور اسی کو چندر گپت
اوّل کی با ضابطہ تخت نشینی کی تاریخ سمجھنا چاہیئے اگرچہ
کمار دیوی سے اس کی شادی ۳۰۸ء میں ہوی تھی؛ غرض
جس طرح ۳۲۲ ق م میں چندر گپت موریا کی تخت نشینی
نے مگدھ کی پہلی سلطنت کا آغاز کیا تھا اسی طرح اس کے
ہمنامِ چندر گپتا کی بادشاہی ۳۲۰ء سے مگدھ کے دوسرے
دورِ فروغ کا افتتاح کرتی ہے۔

سمدر گپت لیکن عہد چندر گپت کے واقعات کا ہمیں تفصیلی

طور پر علم نہیں اور نہ یہ معلوم ہے کہ اس نے کب وفات پائی۔ قرائن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی وفات کا اور اس کے بیٹے سمدر گپت کی جانشینی کا سال ۳۳۰ء ہے اور گپت خاندان کا یہی وہ اقبال مند بادشاہ ہے جس نے مگدھ کو دوبارہ ہند کی سب سے بڑی سلطنت بنا دیا۔ دربار کے شاعر ہریشن نے اس کے جنگی کارناموں کے بیان میں جو قصیدۂ مدحیہ لکھا تھا وہ اشوک کی ایک لاٹھ پر کندہ کیا ہوا ملا ہے۔ اور یہ انسانی مذاق اور خیالات کے تنوّع کا عجیب نمونہ ہے کہ لاٹھ کے ایک پہلو پر تو درویش مزاج اشوک "نفس کشی" کو انسان کی سب سے بڑی فتح بتاتا ہے اور دوسری طرف دیکھیے تو سمدر گپت کو جنگ جوئی اور جدال و قتال پر اس قدر ناز ہے کہ وہ بادشاہ کا فرض ہی "ملک گیری" کو قرار دیتا ہے؛ بہر حال، اگر ہریشن کے قصیدے میں کچھ بھی صداقت ہے تو اس بات کو ماننا پڑے گا کہ غالباً سمدر گپت تاریخ ہند کا سب سے بڑا فاتح گزرا ہے جس نے دکن پر گیارہ حملے کئے اور شمال میں نو بڑی بڑی لڑائیاں لڑا۔ بدوی قبائل کے سرداروں یا سرحد پر ہمسایہ بادشاہوں سے جو مقابلے ہوتے رہے وہ ان کے علاوہ ہیں؛ واضح رہے کہ ہریشن کا قصیدہ کوئی باقاعدہ تاریخی تحریر نہیں ہے اور عہد سمدر گپت کے واقعات و سنین بھی بہت کچھ تاریک و مشکوک ہیں۔ مگر ہم یہاں اتنا کر سکتے ہیں کہ ونسنٹ اِسمتھ کی تحقیقات کا خلاصہ

*

پیش کر دیں۔ کیونکہ یہی وہ مصنّف ہے جس نے کئی سال کی محنت و عرق ریزی کے بعد سمدر گپت کے حالات دریافت کئے اور اسے دنیائے تاریخ میں رو شناس کیا ورنہ پہلے لوگ اِس کا نام تک نہ جانتے تھے ؛

فتوحات اور وسعت سلطنت

ونسنٹ اسمتھ اپنی تاریخ میں لکھتا ہے کہ قدیم ہندوستان کے اس "نپولین" یا "مَلِک کافور" نے اوّل شمالی علاقوں کو فتح کیا ہوگا جس کے بغیر جنوب کے دور دست ممالک میں پیش قدمی کرنا دشوار تھا۔ ٹھیک سن کا پتہ نہیں چلتا لیکن غالباً جنوب پر اس نے ۳۴۰ء کے قریب زمانے میں فوج کشی کی اور پہلے وادئ مہاندی کے راجہ مہندر کو زیر کیا۔ پھر وسط ہند کی غیر آباد اور نیم متمدّن ریاستوں کو پامال کرتا ہوا وہ مُلک کلنگ میں در آیا اور وہاں کے بعض مشہور قلعے اور پائے تخت پشت پور کو اس نے مسخّر کیا۔ یہ شہر دریائے گوداوری کے دہانے سے پچیس تیس میل شمال میں واقع اور پتھاپورم کے نام سے مشہور ہے ؛ پھر اُس نے گوداوری اُتر کے ونگی کے راجہ کو شکست دی اور کانچی (یا کنجی ورم) تک بڑھ آیا جہاں ان دنوں پلّو (Pallava) قوم کا کوئی راجہ حکومت کرتا تھا۔ اسی شہر کو جو پیلار ندی پر موجودہ مدراس کے جنوب مشرق میں واقع ہے، اولوالعزم حملہ آور کی پیش قدمی کی جنوبی حد سمجھنا چاہیئے، غالباً یہیں پہنچ کر اس نے اپنے فتحمند رفقا کو واپسی کا حکم دیا اور موجودہ

مہاراشٹر اور خاندیس کے راجاؤں کو مغلوب کرتا ہوا، منظفر و منصور اپنے وطن میں داخل ہوا (قیاساً ۳۵۰ء) بے شبہ ان جنوبی فتوحات میں بہت کچھ لوٹ کا مال حملہ آوروں کے ہاتھ آیا ہوگا لیکن یہ علاقے مستقل طور پر سلطنت مگدھ میں شامل نہیں ہوئے اور سمدر گپت محض اطاعت کا عارضی اقرار لے کر واپس چلا گیا۔ اس کی سرحدی لڑائیاں جن کا ہریشن بہت بڑھا چڑھا کے ذکر کرتا ہے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتیں البتہ ان سے سمدر گپت کی حدود سلطنت قرار دینے میں مدد ملتی ہے اور ہم خاصی طرح یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہگلی سے جمنا اور ہمالیہ سے نربدا تک کشور ہند کا بہترین حصہ سمدر گپت کے زیر نگیں تھا اور ان کے آگے بھی مشرق و جنوب کی سرحدی ریاستیں اس کی اطاعت کا دم بھرتی تھیں۔

ایسے طاقتور ہمسائے سے کابل و بخارا کے شاہان کشان کو دوستانہ تعلقات پیدا کرنے کا خیال آیا تو یہ قدرتی بات تھی۔ لیکن دربار لنکا سے رسل و رسائل کا سبب دوسرا پیدا ہوگیا۔ وہ یہ کہ وہاں کے ہمعصر بادشاہ سری میگھ ون نے بودھ گیا کی زیارت کے لئے دو بھکشو بھیجے اور ان غریب الوطن راہبوں کی ہندی باشندوں نے کچھ آؤ بھگت نہ کی۔ شاید اس بے مروّتی کا سبب یہ ہو کہ لنکا والے بودھ مت کے جس فرقے میں داخل تھے، یہاں اسے اچھا نہ سمجھا جاتا تھا۔

بہر حال، یہ شکایت لنکا میں پہنچی تو سری میگھ ون نے سمدر گپت کے پاس بہت کچھ تحفے تحائف اور سفیر بھیجے اور درخواست کی کہ دربار لنکا کو اس متبرک درخت کے قریب (جہاں گوتم بدھ کو عرفان حاصل ہوا تھا) خانقاہ بنانے کی اجازت دے دی جائے۔ سمدر گپت نے خوشی سے قبول کیا اور شاہ لنکا نے جو عظیم الشان خانقاہ تعمیر کرائی وہ ہوئین چوئنگ چینی کی سیاحت کے زمانے تک سلامت اور آباد تھی۔

وفات اور ذاتی اوصاف

غالباً دکن کی مہم سے مراجعت کے بعد ہی اس اقبال مند راجہ نے "اشومیدھ" یعنی اسپ قربان کا جشن منعقد کیا تھا۔ مگر اس کے بعد وہ عرصۂ دراز تک فرماں روائی کرتا رہا اور قرائن سے پایا جاتا ہے کہ اُس نے ۳۷۵ء میں وفات پائی۔ ہریشن اپنے ممدوح کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتا ہے اور لکھتا ہے کہ وہ فن شعر و موسیقی میں یگانۂ روزگار تھا۔ اس قول کی قطعی تردید یا تصدیق کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ لیکن اس میں تو کوئی شک نہیں کہ سمدر گپت میں سپہ سالاری اور حکمرانی کی قابلیت بدرجہ اعلیٰ موجود تھی اور موسیقی سے اس کے شوق کا ثبوت وہ سکّہ ہے جس میں وہ تخت پر ایک پاؤں لٹکائے ستار لئے نظر آتا ہے۔ شاعر کا یہ بیان تسلیم نہ کرنے کی بھی کوئی وجہ نہیں کہ سمدر گپت علم و فضل کا قدردان مربّی اور مذہبی مسائل کے مطالعے اور مباحثے کا بہت شایق تھا، اور ہر قسم کے اہل کمال اس کے

دربار کی زینت بڑھاتے تھے۔

چندر گپت ثانی یا بکرماجیت

سمدر گپت نے آئندہ بادشاہی کے لئے اپنے کئی بیٹوں میں سے چندر گپت کو منتخب کر لیا تھا جس نے تخت پر بیٹھکر "بکرماجیت" (Vikramaditya) یعنی شمس الدولہ) کا لقب اختیار کیا۔ ہندوستان میں ایک قدیم راجہ "بیر بکرماجیت" کی حشمت و کامرانی اور عدل و انصاف کے بہت سے قصّے مشہور ہیں، عجب نہیں کہ وہ یہی چندر گپت ثانی ہو۔ اس قیاس کے خلاف سب سے بڑا دھوکا "بکرمی سمت" سے ہوتا ہے جس کا آغاز ۵۸ق م سے ہوا۔ لیکن چندر گپت ثانی کہانیوں کا بیر بکرماجیت ہو یا نہ ہو اس میں شبہ کی مطلق گنجایش نہیں کہ اوّل اوّل یہ سمت "بکرماجیت" کے نام سے منسوب نہ تھا۔[1]

بہر حال، گپت خاندان کا یہ فرماں روا بھی اپنے وقت کا بڑا اقبال مند اور بہادر بادشاہ گزرا ہے اور مالوے پر کئی بار حملے کر کے مغربی ست راپوں کی حکومت کا اسی نے خاتمہ کیا۔ اس طرح، مگدھ کی سلطنت ایک مرتبہ پھر قریب قریب اسی قدر وسیع اور طاقتور ہو گئی جس قدر کہ شاہانِ موریا کے زمانے میں تھی۔ ان ست راپوں کے آخری حکمراں کی ہاتھی پترا میں موت کا قصّہ پہلے ہماری نظر سے گزر چکا ہے۔ مگر

۱۔ انسائی کلو پیڈیا۔ جلد ۱۳ صفحہ ۴۹۷۔

اس سے ہم زیادہ سے زیادہ یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ بکرماجیت کی "فتح گجرات و مالوہ" میں زور و قوت کے علاوہ بعض اتفاقی حادثات یا کسی مکر و فریب کا بھی دخل تھا؛

فاہیان کی سیاحت

اس نامور بادشاہ کی بھی کوئی تاریخ موجود نہیں لیکن خوش قسمتی سے فاہیان چینی[1] اسی کے آخری عہد حکومت میں

---

[1] اس چینی سیاح کے متعلق انسائی کلو پیڈیا میں جو نوٹ لکھا ہے اس کا یہاں ترجمہ کر دینا فائدے اور دلچسپی سے خالی نہ ہوگا:۔

"بودھ مت کے اس چینی درویش نے کہ زائر سیاح اور انشا پرداز بھی ہے ہندوستان کے متعلق چینی زبان میں سب سے پہلی اور قابل قدر کتاب لکھی تھی۔ ان دنوں سلطنت "تسین" (یعنی چین) کا پائے تخت چنگن یا سی گان فو میں تھا، یہیں سے فاہیان روانہ ہوا۔ اور چین کی بڑی دیوار سے گزر کے اس نے "ریت کا دریا" یعنی دشت گوبی طے کیا۔ یہ صحرا "شیاطین اور ہوائے گرم" کا گھر سمجھا جاتا تھا زمین پر کوئی جانور یا ہوا میں کوئی پرندہ وہاں نظر نہ آتا تھا اور صرف مُردوں کی ہڈیاں راستے کا نشان دیتی تھیں؛ ختن پہنچ کر ہمارے سیاح نے بودھ مت کے ایک میلے کی سیر دیکھی جو اُن دنوں وہاں ہو رہا تھا؛ اُس کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسی علاقے میں نیز یارقند و افغانستان میں جو "قرونِ وسطیٰ" کے ختم ہونے سے پہلے پوری طرح اسلامی رنگ میں رنگ گئے تھے، اُس وقت بودھ مت کا دَور دَورہ تھا؛ پھر ہندوکش کی "دیوار جیسی پہاڑیوں" سے اتر کر، جن کی خطرناک بلندی دس ہزار ہاتھ تھی، فاہیان (۴۰۰ء کے قریب) وادیٔ سندھ کے راستے ہندوستان پہنچ گیا اور آئندہ دس برس اس نے "بودھ مت کی اسی مرکزی اقلیم" میں گزارے اور

ہندوستان آیا اور اپنا سفرنامہ ہمارے لئے یادگار چھوڑ گیا ہے؛ بودھ مت کے مقدس مقامات کی زیارت اور کتب و روایات کی تلاش اس کے سفر کی اصلی غرض تھی اور اس لئے وہ کسی دوسری طرف بہت کم توجّہ کرتا ہے حتّی کہ اپنے زمانے کے ہندی فرماں روا کا بھی کوئی ذکر نہیں کرتا۔ بایں ہمہ اس کی تحریر سے بعض کام کی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں اور بکرماجیت کے نظم و نسق کا دھندلاسا خاکہ نظر میں پھر نے

(بقیہ حاشیہ) پشاور سے افغانستان (خاص کر کابل کے علاقے) تک اور دوسری طرف وادیٔ گنگا تک کئی سفر کئے۔اُس کی خاص غرض یہ تھی کہ ان مقامات کی زیارت کرے جن میں گوتم بودھ نے اپنی زندگی بسر کی، مذہبی کتابوں کی نقل حاصل کرے اور اس مذہب کے اُن فقرا اور حکماء کی صحبت سے مستفید ہو جنھیں برہمن (دوبارہ زور پکڑ جانے کے باوجود) ابھی تک مُلک سے دفع نہ کر سکے تھے × × × × × × × لیکن مختلف مقامات کی سیر کے بعد اس کے سفرنامے میں مذہبی اور باطنی مسائل کی طویل بحث آجاتی ہے یعنی کبھی کرامات اور خوارق کے قصے اور کبھی اخلاق کے مباحث، دنیاوی مشاہدات کے لئے کوئی گنجائش نہیں چھوڑتے۔حتّی کہ فاہیان گنگا کے دہانے سے تجارتی جہاز میں روانہ ہو جاتا ہے اور چودہ دن میں لنکا پہنچ کر دم لیتا ہے۔یہیں اس نے اُن مذہبی کتابوں کی نقلیں لیں جن کا چین میں کوئی نام تک نہ جانتا تھا۔وہ تہوار بھی اس نے یہاں دیکھا جس میں ہر سال، گوتم بودھ کے دانت کی لوگ زیارت کرتے تھے۔

دین اسلام کے آغاز سے دو صدی پہلے اس جزیرے میں عربوں کی بحری تجارت کا

لگتا ہے:۔ ہندوستان کے اکثر صوبوں میں فراغت و آسودگی نظر آتی ہے۔ ایسے قوانین بہت کم ہیں جو عمّال کو رعایا کے پریشان کرنے کا موقع دیں۔ جرائم کی سزائیں بھی نسبتاً ہلکی ہیں اور اکثر جرمانوں پر اکتفا کی جاتی ہے۔ رہزنی اور بغاوت کی سزاوں میں عدالت مجرم کا دست راست کاٹ دینے کا حکم دے سکتی ہے لیکن اس انتہائی سختی کی زیادہ نوبت نہیں آتی اور مجرموں کو اذیّت دینے کا بھی رواج نہیں‘‘ ملک میں جرائم کی کمی ہے اور راستے خاصی طرح محفوظ ہیں چنانچہ رستے میں لُٹ جانے کی مصیبت سے جو ساتویں صدی میں

(بقیہ حاشیہ) بھی فاہیان نے ذکر کیا ہے‘‘ یہاں سے وہ سمندر کے راستے دریائے ہنگ سی کیانگ کے دہانے تک پہنچ گیا۔ راستے میں جاوا پر جہاز بدلنے کی ضرورت پڑی اور ایک جگہ طوفان میں اس کا جہاز ڈوبتے ڈوبتے بچا‘‘

چوتھی صدی عیسوی کے اواخر میں ہند اور وسط ایشیا میں جو قوت اور اکثر مقامات پر جو غلبہ بودھ مت کو حاصل تھا‘ فاہیان کا سفرنامہ اس کی نہایت عمدہ شہادت ہے۔ کتاب کے سیاق سے ہر جگہ اس کے مذہبی شغف اور علمیت و فراست کا پتہ چلتا ہے۔ گو کہیں کہیں شوق زیارت نے اسے حد اعتدال سے گزار دیا ہے‘ لیکن جو کچھ اس نے لکھا وہ نہایت احتیاط و صحت کے ساتھ لکھا اور اس کے اکثر مقاماتِ سیاحت کا اِس زمانے میں بہ آسانی پتہ چل جاتا ہے۔ باقی اُس کے مذہبی جذبے کا اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اپنے وطن چین کو وہ محض ’’سرحدی سرزمین‘‘ بتاتا ہے اور بودھ مت کا ’’صدر‘‘ ہندوستان کو قرار دیتا ہے‘‘ جلد دہم صفحہ ۱۲۵

ہوئین چونگ یا ہوئین تسانگ پر گئی مرتبہ پڑی، فاہیان ایک دفعہ بھی دو چار نہیں ہوا۔

کمار گپت۔ اس درویش سیّاح نے بودھ مت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے ہم اگلی فصل میں کام لیں گے یہاں سلسلۂ واقعات درست رکھنے کے لئے کمار گپت کا ذکر کر دینا چاہیئے جس کے زمانے سے گپت خاندان کی حکومت میں زوال آنے لگا۔ وہ اپنے باپ کے بعد ۴۱۳ء میں تخت نشین ہوا اور عرصۂ دراز تک اقبال و کامرانی کے ساتھ حکومت کرتا رہا بلکہ جشن "اشومیدھ" کے بپا کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاید اُس نے کچھ اور علاقہ بھی فتح کیا تھا۔ لیکن آخری ایامِ حکومت میں اُسے کسی ہمسایہ قوم سے سخت زکیں پہنچیں اور ان لڑائیوں نے سلطنت کو ایسا صدمہ پہنچایا کہ وہ کمار گپت کی زندگی میں پوری طرح نہ پنپ سکی۔ اور ادھر اس کے مرتے ہی (۴۵۵ء) ان تاتاریوں کے خوفناک حملے شروع ہو گئے جنھیں عام طور پر "گورے ہون" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

دوسری فصل۔ مذہب اور علوم و فنون

تاتاریوں کی یورش اور گپت خاندان کے زوال و خاتمے کا ذکر اگلی فصل میں آئے گا۔ مگر ان بادشاہوں کے عہد عروج سے

گزرتے وقت مناسب ہے کہ ہم ایک نظر اس زمانے کے اندرونی حالات پر ڈال جائیں، یعنی ۳۳۰ء سے ۴۵۵ء تک اہل ہند کے مذہبی خیالات اور علوم و فنون کے متعلّق جسقدر معلومات حاصل ہو سکی ہے اس کا ضروری خلاصہ پیش کردیں تاکہ ناظرین کو ایک حد تک اس عہد کی اصلی تہذیب کے سمجھنے کا موقع مل جائے۔

بودھ مت کا ظاہری حال (مذہب)

مذہب کے متعلق ہمارا سب سے اچھا ماخذ فاہیان چینی کا سفرنامہ ہے جس نے پانچویں صدی کے آغاز میں شمالی ہندوستان کے بہت سے مقامات کی سیاحت کی اور لوگوں کے مذہب خاص کر بودھ مت کے حالات تفصیل سے قلم بند کئے۔ اس نے اپنے پہلے ہی سفر میں دریائے سندھ سے جمنا تک بودھ مت والوں کی بہت سی خانقاہیں دیکھیں جن میں ہزاروں بھکشو اس مذہب کی تعلیم و تربیت حاصل کرتے تھے۔ بودھ کے قوانین کی ہر جگہ پابندی کی جاتی تھی۔ جانداروں کو مارنا، مویشی کی خرید فروخت حتیٰ کہ مرغ پالنا بھی نہایت مذموم سمجھا جاتا تھا۔ اور اس قانون کے دائرے سے اگر کوئی باہر تھا تو وہ چنڈال قوم کے لوگ تھے جنھیں اُن کے دُوسرے بنی نوع اس قدر نجس جانتے تھے کہ ذرا چھو جانا اُن کے تمام جسم کو ناپاک کر دیتا تھا۔ بودھ مت کے بھکشوؤں کی بڑی عزت کی جاتی تھی۔ ہر صاحبِ استطاعت انہیں خیرات دینا موجب ثواب جانتا تھا اور

سرکاری طور پر اُن کی خانقاہوں کے نام جو رقوم یا جاگیریں ملتی تھیں وہ اس کے علاوہ ہیں۔"

برہمنی مت کا احیاء

لیکن یہ بودھ مت کے ایک پر جوش زائر کے خیالات ہیں جسے اپنے مقدس مقامات کے دیکھنے کا شوق صدہا میل سے ہندوستان کھینچ لایا تھا۔ یہی سبب ہے کہ وہ اپنے مذہب کی ہر شے کو عقیدت مندانہ دیکھتا ہے اور اس کی کمزوری یا خامی پر گہری نظر نہیں ڈالتا۔ اپنے مشاہدات بیان کرنے میں اس نے صداقت سے تجاوز نہیں کیا بایں ہمہ بودھ مت کے غلبے کی جو تصویر کھینچی وہ اس کی سادگی اور ظاہر بینی کی غماز ہے۔ جدید اہل تحقیق نے اس بات کے ثبوت فراہم کر لئے ہیں کہ جب فاہیان ہندوستان آیا تو اس وقت بودھ مت میں زوال شروع ہو گیا تھا۔ خانقاہوں کی دولت مندی یا رونق محض نمائشی چیز تھی ورنہ اس کی اصلی قوت تیسری صدی سے گھٹنے لگی تھی اور حریفِ قدیم (یعنی برہمنی مت) کا زور بڑھ رہا تھا۔"

برہمنوں کے اس طرح دوبارہ فروغ پانے کے اندرونی اسباب خواہ کچھ ہی ہوں یہ امرِ واقعہ ہے کہ مالوے کے ست راپ اور گپت خاندان کے فرماں روا اُن کے پر جوش حامی تھے۔ اس بات کی شہادتیں موجود ہیں کہ بودھ مت کے عین عروج کے زمانے میں بھی، ہندوستان کا قدیم مذہب فنا نہیں ہوا تھا بلکہ پہلی صدی عیسوی ہی میں بعض گشان

بادشاہ شوجی کے پرستار یعنی برہمنوں کے معتقد تھے۔ خود مہاراجہ کنشک کے عہد میں بودھ مت کے جس فرقے (یعنی "مہایانی") نے فروغ پایا اس کے بعض عقائد میں برہمنوں سے اتفاق کر لیا گیا تھا اور بُت پرستی غالباً اس سے بھی پہلے ان کے ہاں جائز و رائج ہوگئی تھی۔ پس یہی دو باتیں اس بات کا کافی ثبوت ہوسکتی ہیں کہ بودھ مت اپنی جگہ پر قائم نہ رہ سکا اور اس کے علما کو برہمنوں کے مقبولِ عام عقائد اختیار کرتے ہی بنی۔ ظاہر میں تو یہ اُس کی قبولیت کو بحال رکھنے کی بہت کارگر تدبیر تھی مگر درحقیقت اپنے مابہ الامتیاز اصول کو بدلنا، گویا بودھ مذہب کی جُداگانہ ہستی کو مٹا دینا تھا۔

سنسکرت کا احیاء

بودھ مت کے اس زوال کا برہمن اگر سبب نہ تھے تو سب سے زیادہ فائدہ اُٹھانے والے ضرور تھے۔ اور ان کو بڑی تقویت اپنی قدیم زبان کی بدولت پہنچی جس نے اسی زمانے میں دوبارہ سر اُبھارا اور شاہانِ گپت کی قدردانی سے بہت جلد ہندوستان کی مروّجہ پراکرتوں پر غالب آگئی۔ منو کا دھرم شاستر، کالیداس کی شاعری، آریا بھٹ کی ہیئت و ہندسہ کی تصانیف، اسی زمانے کی شہرۂ آفاق یادگاریں ہیں جنھوں نے سنسکرت کو ہند کی سب سے مستند علمی زبان بنا دیا۔ پرانوں کے پہلے مجموعے (وایوپران) کو بھی اسی زمانے سے منسوب کرتے ہیں اور ونسنٹ اسمتھ کے نزدیک وہ

چوتھی صدی کے نصف اول میں مرتب ہوا" اسی مورخ کی رائے ہے کہ خاندانِ گپت کے زمانے میں اس علمی تحریک کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ انہی ایام میں اہل ہند کو چین و رومتہ الکبریٰ کے تمدن سے روشناس ہونے کا موقع ملا۔ ممالک غیر سے میل جول ہمیشہ قوموں کی علمی اور دماغی ترقی کا محرک ہوتا ہے اور گو ظاہری ثبوت میسّر نہ آئیں، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اُن دنوں رومی مقبوضات سے ہندوستان کے تجارتی تعلّقات اور آمدرفت کا سلسلہ جاری تھا۔ اور چین سے دینی اور دنیاوی تعلّقات ہونے کی تو بہت سی شہادتیں موجود ہیں"

عمارت سنگتراشی اور نقاشی

مگر اس عہد میں غالباً سب سے نمایاں ترقی عمارت و نقّاشی کے فن میں ہوی اور قدیم ایرانیوں کی تقلید سے ہندوستان کے معمار اسی زمانے میں آزاد ہوے۔ کیونکہ تاریخ کی جہاں تک دسترس ہے، قدیم سے یہاں کی بڑی عمارات ایرانی محلات کے طرز پر بنائی جاتی تھیں۔ لیکن گپت خاندان کے ایام حکومت میں جہاں عمارتی نقش و نگار کے فن میں بڑی ترقی ہوی وہاں خود عمارات کی بھی نئی نئی صورتیں نکالی

۱؎ سواحلِ ہند اور جزائر شرق الہند میں اُن دنوں خوب آمدرفت تھی اور بعض تحریروں میں رومی قیصروں کے ہاں ہندوستانی سفارتوں کے جانے کا بھی ذکر آیا ہے" (اُوکس ص-۱۶۲)

جانے لگیں اور اسی زمانے کا خاص طرز عمارت مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے تک مقبول رہا[1]*

فن عمارت کے ساتھ قدرتی طور پر سنگ تراشی نے فروغ پایا اور اس فن کے بہترین ہندی نمونے اسی زمانے سے منسوب کئے جاتے ہیں؛ اسی ضمن میں ونسنٹ اسمتھ نے نقاشی کی ترقی کو بھی اس عہد سے منسوب کیا ہے اور نظیر میں غار ہائے اجنتہ کی لا جواب تصویریں پیش کی ہیں (ارلی ہسٹری صفحہ ۳۰۶) ان میں سے بعض تصویریں زیادہ قدیم ہیں اور بعض چھٹی ساتویں صدی عیسوی، یعنے اس

---

[1] انسائی کلو پیڈیا۔ جلد چہاردہم صفحہ ۱۲۹ -

* ونسنٹ اسمتھ اپنی تازہ ترین کتاب میں لکھتا ہے کہ "عہد گپت کا سب سے مشہور اور قابل دید سنگی مندر دیوگڈہ ضلع جھانسی میں سلامت رہ گیا ہے اس کی تعمیر پانچویں صدی یا چھٹی صدی کے نصف اوّل سے منسوب کر سکتے ہیں اور اس کی دیواروں پر ہندی سنگ تراشی کے بعض بہترین نمونے موجود ہیں۔ مگر یہ مندر زیادہ وسیع نہیں اور بھیتر گاؤں ضلع کانپور کا خشتی مندر اس سے بڑا ہے جو غالباً چندر گپت ثانی کے عہد میں بنا تھا۔۔۔۔ اس عہد کے صناع اور کاریگر دھاتوں کے کام میں بھی پوری مہارت رکھتے تھے۔ دلّی میں جو لوہے کی لاٹھ ہے وہ سمدر گپت کے زمانے میں ڈھالی گئی اور صنعت قلب معادن کا لاجواب نمونہ ہے؛ وسیع پیمانے پر تانبے کے بُت ڈھالنے کا عمل بھی ان دنوں کامیابی سے کیا جاتا تھا۔ چنانچہ گوتم بودھ کی ایک ڈھلی ہوی مورت جو نالندا (بہار) میں چھٹی صدی کے اواخر میں نصب کی گئی تھی، ۲۶ گز کے قریب اونچی تھی۔ اس کی ایک اور پانچ ہاتھ اونچی مورت جو سلطان گنج سے دستیاب ہوی، برمنگھم (انگلستان) کے عجائب خانہ میں موجود ہے، اور یہ چندر گپت ثانی کے عہد میں تیار کی گئی تھی۔۔"

(اوکس ہس - ۱۶۱)

زمانے کے بعد تیار ہوئیں جو ہمارے پیش نظر ہے[1]
لیکن یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ اجنتہ کے دو غار
اسی پانچویں صدی میں تراش کر آراستہ کئے گئے تھے[2]

تیسری فصل۔ ہونوں کی یورش اور گپت خاندان کا خاتمہ

سکند گپت

لیکن اب ہمیں پھر اپنے سلسلۂ تاریخ کی طرف عود کرنا چاہئے کہ جب راجہ کمار گپت نے ۴۵۵ء میں وفات پائی اور اس کا بیٹا سکند گپت جانشین ہوا تو سلطنت مشکلات میں گھری ہوی تھی۔ اس کا باپ اپنے آخری زمانہ میں جس قوم (''پشی متر'' نامی) سے مصروف جنگ رہا گو اس کے متعلق یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ وہ شمالی ہند کی تھی یا جنوب کی تاہم وہ اتنی قوی ضرور تھی کہ کمار گپت کی فوجوں پر غالب آئی اور اگر ولی عہد (یعنی سکند گپت) ہمت و جفاکشی سے کام نہ لے تو سلطنت کی خیر نظر نہ آتی تھی لیکن سکند گپت نے رات کو رات اور دن کو دن نہ سمجھا اور سخت کوشش کے بعد آخرکار غنیم پر فتح

---

[1] انسائی کلوپیڈیا جلد اول صفحہ ۱۵۴

[2] اوکسفورڈ ہسٹری صفحہ ۱۶۱ بحوالۂ جرنل ایشیاٹک سوسائیٹی

پائی۔ اس لڑائی سے نجات حاصل ہوئے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ وسط ایشیا کے خانہ بدوشوں کا سیلاب ہند پر اُمنڈ پڑا۔ اور سکند گپت کو بادشاہ ہوئے غالباً تین سال بھی نہ ہوئے تھے کہ اُسے سلطنت کو وحشیوں کے اس ٹڈی دل سے بچانے کی فکر پڑ گئی۔ مگر پہلی مرتبہ اس نے فتح پائی (قیاساً ۴۵۵ء) اور چند سال کے لئے اس بلائے سخت کو ٹال دیا۔

"گورے ہون" یہ خوفناک حملہ آور نسلاً وسط ایشیا کی انہی اقوام سے تعلق رکھتے ہیں جن کی یورشیں بار بار یورپ و ایشیا کے امن میں خلل ڈال دیتی تھیں۔ مگر پانچویں چھٹی صدی عیسوی میں اُن کے جو گروہ اپنے غیر آباد علاقوں سے نکل کر ایران و ہندوستان پر حملہ آور ہوئے ان کے قومی نام میں اختلاف ہے۔ اسلامی مصنف انہیں "ہیتان" اور چینی "یتیھا" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اصلی نام غالباً "ہیپ تال" تھا اور مشرقی رومیوں نے اسی کو بدل کر "اِفتالوی" کر دیا جو تھوڑے سے تغیّر کے ساتھ یورپ کی زبانوں میں رائج ہے۔ (انگریزی میں Ephtalite کہتے ہیں) لیکن ہندوستان میں ان کو "ہون" (ھُونڑ یا ھُونا) کہتے تھے۔ چونکہ یہ بہت عام نام ہے اس لئے رنگ کی مناسبت سے سفید یا گورے کی صفت بڑھا دی گئی کہ دوسرے تاتاریوں میں اور ان پانچویں صدی کے حملہ آوروں میں

امتیاز کیا جا سکے ؛

معلوم ہوتا ہے کہ ان وحشیوں نے پانچویں صدی کے آخر میں ماوراءالنہر پر قبضہ پا لیا تھا اور وہاں سے ایران و ہندوستان کی جانب پاؤں پھیلا رہے تھے۔ ساسانی بادشاہوں سے ان کی (بہرام پنجم کے وقت سے خسرو نوشیرواں کے کے زمانے تک) بار بار لڑائیاں ہوتی رہیں اور سلطنت ایران کو اس خطرے سے نجات اس وقت ملی جب کہ نوشیرواں کے تُرک حلیفوں نے ان کی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا (۵۶۵ء) تاریخ میں ترکوں کا نام پہلی مرتبہ اسی ضمن میں آیا ہے ؛

گپت خاندان کے آخری بادشاہ

لیکن ہونوں کا جو سیلاب ہندوستان کی طرف بڑھا تھا وہ یہاں کے بادشاہوں کے روکے نہ رُکا۔ غالباً پہلی لڑائی جس میں سکند گپت نے فتح پائی اور بہت کچھ خوشیاں منائیں[1]، ہونوں کے پورے لشکر کے ساتھ نہیں ہوی تھی اور وہ ان دنوں ایران پر قبضہ کرنے کی دھن میں لگے ہوے تھے ؛ چنانچہ جب ادھر سے کسی قدر فرصت ملی تو انہوں نے دوبارہ ہندوستان کا رخ کیا اور شمال مغربی

---

[1] فتح کی یادگار میں سکند گپت نے ایک مینار پر وشنو دیوتا کا بت نصب کرایا تھا اس مورت کا پتہ نہیں لیکن وہ مینار ضلع غازی پور میں اب تک موجود ہے۔ اس پر جو کتبہ کندہ تھا وہ بھی اتفاق سے محفوظ رہ گیا ؛ ۱۲

پنجاب پر قابض ہو گئے۔ اب سلطنت گپت کا علاقہ قریب تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ چند ہی سال میں اپنے پنجے پنجاب میں جمانے کے بعد انہوں نے پھر سکندگپت پر یورش کی؛ یہ باہمت راجہ اس مرتبہ ان خوفناک حملہ آوروں سے کے مقابلے کی تاب نہ لا سکا اور مگدھ خاص کے سوا، تمام سلطنت پر ہونوں کا تسلط ہو گیا؛

ان واقعات کی تفصیل اور سنین کا ٹھیک علم نہیں لیکن اتنا یقینی ہے کہ سکندگپت کے بعد (۴۶۷ء) اس خاندان کے راجہ فقط مگدھ اور چند قریبی اضلاع کے حاکم رہ گئے تھے؛ ان میں پہلا شخص پورگپت ہے جس نے سکّے کی اصلاح کی یعنی سکندگپت کے وقت میں خزانہ خالی ہو جانے کی وجہ سے جو کم عیار اشرفی رائج کرنی پڑی تھی اس کی بجائے طلائے خالص کی اتنی بڑی اشرفی ضرب کرائی کہ پہلے ہندوستان میں کبھی رائج نہ ہوی تھی؛

۴۸۵ء میں پورگپت کا بیٹا نرسم گپت بالادت راجہ ہوا اور اس نے عرصۂ دراز تک حکومت کی جو ایشیائی ممالک میں اقبال مندی کی پہلی دلیل ہے؛ نرسم گپت کی دولت و حشمت کا دوسرا ثبوت وہ رفیع الشان مندر تھا جس کا ہوئین چوئنگ نے اپنے سفر نامے میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ یہ خشتی عمارت سو گز بلند تھی اور اس کی آراستگی میں بے شمار زر و جواہر صرف کیا گیا تھا۔ نرسم گپت نے یہ مندر بودھ مت والوں کے لئے

ہونوں کی دوسری شکست

ان کے سب سے بڑے علمی مرکز نالندا[1] میں بنایا اور اسی سے ظاہر ہے کہ وہ بودھ مت کا پیرو یا کم سے کم معتقد ضرور تھا۔

لیکن نرسم گپت کی سب سے بڑی وجہ نام آوری یہ ہے کہ (ہوئین چوئنگ کے بقول) اسی نے وسطِ ہند کے راجہ جس دھرمن (یشو دھرمن Yasodharman) اور دوسرے رؤسا کے ساتھ مل کر ہونوں کو شکست دی[2] اور ان کے بادشاہ مہرگل (Mihiragula) کو مالوے سے مار کر نکال دیا۔ ہونوں کے پہلے سردار کا نام ترآمن یا تُرمان (Toramana) تھا اور اسی کی سپہ سالاری میں ان وحشیوں نے پنجاب، دوآب اور وسطِ ہند کے ملک فتح کئے چنانچہ پانچویں صدی کے خاتمے کے قریب ہم اسے مالوے میں حکمراں پاتے ہیں۔ والبھی[3] کے

---

[1] اس مقام پر جو گاؤں کلکتے کے چند میل شمال میں اب آباد ہے اُسے ”بڑگاؤں“ کہتے ہیں۔۱۲

[2] رسالہ ”ہندوستان ریویو“ (ماہ جنوری ۱۹۱۸ء) میں مسٹر پنّالال نے بہ دلائل ثابت کیا ہے کہ نرسم گپت کا اس فتح میں کوئی خاص حصّہ نہ تھا بلکہ وہ زیادہ تر جس دھرمن ہی کی سعی سے حاصل ہوی تھی۔ اس رائے کو ونسنٹ اسمتھ نے بھی تسلیم کر لیا ہے (آوکس ہسٹری ۔ ”اڈیشنز اینڈ کرکشنز“)

[3] یہ شہر مشرقی گجرات میں اس جگہ واقع تھا جہاں اب (بھاؤنگر سے چند میل شمال مغرب میں) قصبہ ولّا آباد ہے چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی میں یہاں بودھ مت والوں کی بہت مشہور درس گاہ تھی اور آٹھویں صدی تک یہاں کے راجہ خود مختارانہ حکومت کرتے رہے حتی کہ عرب فاتحان سندھ نے ان کی بادشاہی کا چراغ گل کر دیا۔

راجہ جنھوں نے مشرقی گجرات میں انہی دنوں اپنی علٰحدہ سلطنت بنالی تھی، ترمان کے خراج گزار تھے اور اس ہون سردار نے ہندوستان کی چند ہی روز ہوا کھا کر "مہاراجہ" کا لقب اختیار کرلیا تھا؛ پھر جب وہ مرا (غالباً ۵۰۲ء میں) تو اس کے بیٹے مہر گل (Mihiragula) نے یہی لقب اور شِو پرستوں کا ہندی مذہب اختیار کیا۔ وہ نہایت سفّاک اور جابر فرماں روا تھا اور بودھ مت کی کتابوں میں اس کے وحشیانہ مظالم کے بہت سے قصے محفوظ ہیں؛ مگر یاد رکھنا چاہئے کہ ابھی تک ہونوں کی مرکزی قوّت میں زوال نہیں آیا تھا اور اس لئے ترمان و مہر گل غالباً اپنی اُسی صدر حکومت کے ماتحت تھے جس کا پائے تخت ہرات کے قریب بامیان میں واقع تھا؛

*

بہر حال، اسی مہر گل کے ظلم و جور سے تنگ آکر ہندوستان کے بہت سے رئیسوں نے ایکا کیا اور غالباً جس دھرمن کی سپہ سالاری میں ہونوں کو شکست دی (قیاساً ۵۲۸ء) ادھر مہر گل کے چھوٹے بھائی نے بغاوت کی اور پائے تخت ساکل (Sakala یعنی موجودہ سیالکوٹ) پر قبضہ کرلیا؛ ان وجوہ سے ہونوں کو مالوہ چھوڑنا پڑا اور خود شکست خوردہ مہر گل نے بھاگ کر کشمیر میں پناہ لی۔ کشمیر کے فرماں روا نے (جو غالباً اس کا ہم قوم تھا) مہربانی سے ایک جاگیر یا علاقہ عنایت کردیا تھا مگر دو سال بعد مہر گل نے اپنے مُربّی سے بغاوت کی اور اسے دھوکے سے قتل کرا کے خود بادشاہِ کشمیر بن بیٹھا۔

پھر اُس نے ہزارہا آدمیوں کو دریائے سندھ کے کنارے ذبح کرا دیا اور پہلے فرماں روا کے خاندان میں کسی فرد کو زندہ نہ چھوڑا۔ وہ شِو دیوتا کا پرستار تھا اور اس لئے بودھ مت والوں سے اس کو شدید نفرت تھی۔ چنانچہ اس مذہب کے درویشوں پر اس نے بڑے بڑے ظلم کئے اور ان کی بہت سی خانقاہیں تڑواکر جو کچھ ہاتھ آیا لوٹ لیا ؛

یہ خلاصہ ہے اُن روایات کا جو ہوئین چوئنگ نے اپنے ہندی ہم مذہبوں سے سن کر تحریر کی ہیں۔ مہر گل کی موت کے متعلق اس چینی سیّاح نے یہ روایت نقل کی ہے کہ "جب وہ مرا تو اولے اور بجلی کے طوفان آئے، آسمان تیرہ و تار ہوگیا، زمین ہل گئی اور مقدّس ولیوں نے فرمایا کہ دیکھو ہزاروں بے گناہوں کو مارنے اور بودھ کا قانون توڑنے کی یہ سزا ہے کہ مہر گل کو دوزخ کے سب سے نیچے طبقے میں پھینک دیا گیا جہاں وہ صدیوں تک انہی سخت عقوبتوں کے چکّر میں رہے گا۔" اور یہی روایت غمازی کرتی ہے کہ مذکورہ بالا تمام بیان میں مخالفانہ رنگ آمیزی سے کام لیا گیا ہوگا ؛

مگر مہر گل دوزخ میں گیا ہو یا جنّت میں، ہمیں اس مقام پر جو کچھ یاد رکھنا چاہیئے وہ یہ ہے کہ مہر گل کی وفات ۵۴۲ء یا اس کے قریب زمانے میں واقع ہوی، جب کہ ہونوں کی طاقت میں ہر طرف زوال کے آثار

ہونوں کا خاتمہ

نمودار تھے؛ مذکورۂ بالا سن کے تقریباً پچیس برس بعد ترکوں نے ان کی صدر حکومت کا بھی قلع قمع کر دیا جس کا اوپر اشارۃً ذکر آچکا ہے۔ ہندوستان میں ان کی قوت غالباً مہر گل کے مالوے سے فرار ہوتے وقت ہی کمزور ہوگئی تھی اور کچھ باقی تھی تو اس کے بعد اس قوم کے جو لوگ مختلف اقطاعِ ہند میں آباد ہو گئے تھے وہ بہت جلد اہل ہند کے ساتھ گھل مل کے اپنا نسلی امتیاز کھو بیٹھے اور تھوڑے ہی عرصے کے بعد ہندوستان کی علمی زبان میں اس لفظ کا مفہوم تک بدل گیا؛

جس دھرمن

اس ضمن میں باب ختم کرنے سے پہلے مالوے کے راجہ "یشو دھرمن" یا جس دھرمن کے متعلق اتنا لکھنا ضروری ہے کہ مالوے میں اس کے تین کتبے ملے ہیں جس میں نہ صرف ہونوں پر مذکورہ بالا فتح اس سے منسوب کی ہے بلکہ اسے تمام ہندوستان کا فرماں روا بتایا گیا ہے اور لکھا ہے کہ جو علاقے گپت خاندان کے مہاراجہ اور ہون فتح نہ کر سکے تھے جس دھرمن راجہ نے انہیں بہ زورِ شمشیر فتح کیا؛ سوائے ان کتبات کے اور کہیں اس راجہ کا نام نہیں آتا اور ہوئین چوئنگ نے مذکورۂ بالا جنگ کے حال میں اشارۃً بھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ چنانچہ ونسنٹ اسمتھ نے اپنی ارلی ہسٹری (مطبوعہ ۱۹۱۴ء) میں ان کتبات کی صحت سے انکار کیا تھا لیکن تازہ ترین تحقیقات سے پایا جاتا ہے کہ

جس دھرمن کم سے کم مالوے کا راجہ ہوگا اور مہرگل کی شکست میں غالباً سب سے زیادہ اسی کی سعی کو دخل تھا۔"
(اوکس ہس - ۱۶۳)

ضمیمہ باب ہشتم

کالی داس اور اس کی شاعری

سنسکرت زبان کے سب سے نامور شاعر کالیداس کے متعلق اہل تاریخ کو کوئی بات صحت کے ساتھ معلوم نہیں۔ روایتِ عام کی رُو سے تو وہ پہلی صدی ق م میں ہوا ہے لیکن جدید تحقیقات اسے بہت بعد کا آدمی قرار دیتی ہے۔ لاسن اور ویبر جو کہ سنسکرت علم ادب کے مستند ماہر مانے جاتے ہیں، اس کا زمانہ تیسری صدی عیسوی بتاتے ہیں۔ مشہور ہے کہ وہ راجہ "بیر بکرماجیت" کے دربار کا ایک "رتن" تھا۔ مگر خود اس "بکرماجیت" کا زمانہ متعیّن کرنا دشوار ہے۔ اوپر ہم پڑھ آئے ہیں کہ چندرگپت ثانی نے اپنا لقب "بکرماجیت" رکھا تھا اور اگر کہانیوں میں جس "بکرماجیت" کا ذکر آیا ہے وہ یہی راجہ تھا، اور کالیداس اس کے "نورتن" میں داخل تھا تو پھر اس شاعر کا

زمانہ چوتھی صدی کا آخری حصّہ ہوگا۔[1]

بہر حال، وہ کسی زمانے میں ہوا ہو" اس کے تخیّل کی قوّت، اس کے بیان کی قدرت، طبعیت کی پاکیزگی اور فطرت کی دل آویزیوں سے اس کا متاثر ہونا" وہ اوصاف ہیں جو اُسے شعراے عالم کی صفِ اوّل میں شمار ہونے کا مستحق بناتے ہیں۔ کم سے کم ہندوستان میں آج تک کوئی ناٹک اس کی "شکنتلا" اور "وکرم اروسی" کے پائے کا نہیں لکھا گیا۔ ان دونوں کے بہت سی زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں مگر کالیداس کی تصانیف میں بہترین "شکنتلا" ہی کو مانا جاتا ہے۔ تیسرا ڈراما "مالوی کاگنی متر" اس درجے کی نظم نہیں۔ نہ اتنا مشہور و مقبول ہوا۔ "رگھو بنس" اور "کمار سمبھو" کی تصنیف بھی کالیداس سے منسوب کرتے ہیں۔ یہ دو طویل مثنویاں ہیں جن میں سے ایک راجہ رام چندر جی کے آبا و اجداد کا حال سناتی ہے اور دوسری میں خداے جنگ "کمار دیو" کی ولادت کا سماں دکھایا گیا ہے۔ مگر غالباً ان سب سے زیادہ پُرکیف نظم "میگھ دُت" (یعنی "نامہ برِ آبر") ہے؛ ایک دُور افتادہ شوہر عالمِ خیال میں بادلوں کو مخاطب کرتا ہے اور اُن کے ہاتھ اپنی محبوب بیوی کو اپنے حال کی اطلاع بھجواتا ہے۔ اور اسی کے بیان کرنے میں شاعر نے اپنی شاعری کا کمال دکھایا اور جذبات انسانی کی ترجمانی کا حق ادا کر دیا ہے۔ موسموں پر

*

[1] ونسنٹ اسمتھ اُسے پانچویں صدی کا آدمی بتاتا ہے (اوکس ہس ۱۶۱)

کالیداس نے جو چھوٹی سی نظم لکھی وہ معمولی "بارہ ماسے" کی قسم کی ہے باقی "نل دے" یا اور بہت سی مثنویاں ڈرامے وغیرہ جو اس کے نام سے مشہور ہیں، طرز بیان کے اعتبار سے بالکل مختلف ہیں اور چونکہ "کالیداس" نام کے اور بھی دو تین شاعر ہو گزرے ہیں لہٰذا یقینی طور پر یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ کس کالیداس کی تصنیف ہیں؛

اُوکس فورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر مکڈانل جن کی زبان سنسکرت پر کئی کتابیں مشہور ہیں، کالیداس کی شاعری کے بڑے مدّاح ہیں مگر اسی کے ساتھ ان کی رائے ہے کہ وہ بعض جگہ بہت تصنّع سے کام لیتا ہے اور اس کے کلام میں وہ بے تکلّفی نہیں پائی جاتی جیسی کہ وید کے قدیم اشلوکوں میں نظر آتی ہے۔ دوسرے اس کی نظم کے مختلف حصوں میں وہ تناسب نہیں جو "اجزا" کو "کُل" کے ساتھ ہونا چاہیئے اور قدیم یونانی اساتذہ کا خاص امتیاز تھا؛

باب نہم

پہلی فصل - راجہ ہرش کا زمانہ

ونسنٹ اسمتھ نے اپنی قدیم ہندوستان کی تاریخ میں تین نقشے دیئے ہیں اور سب سے اقبال مند راجاؤں کی حدودِ سلطنت دکھائی ہیں۔ چنانچہ ایک اشوک راجہ کی سلطنت کا نقشہ ہے دوسرے میں سمدرگپت کے مقبوضات دکھائے ہیں اور تیسرے میں راجہ ہرش کے؛ یہ نقشے ایک حد تک ظنّی ہیں بایں ہمہ تاریخ کے طالب علم کی سب سے پہلے جس شے پر نظر پڑے گی وہ یہ ہے کہ جو بادشاہ زیادہ قدیم ہے اُسی کی سلطنت زیادہ وسیع ہے:- افغانستان کی رودِ ہلمند سے دکن کی پینار ندی تک اشوک راجہ کی حکومت تھی۔ سمدرگپت صرف نربدا اور چناب کے درمیان کے علاقہ کا مالک تھا۔ ہرش کے زمانے میں وسط پنجاب کا رنگ بھی نقشے میں سادہ ہے کیونکہ ستلج سے اُوپر اس کی حکومت نہ تھی! کیا اس کے معنی یہ ہے کہ اہل ہند کے قوائے فطری میں زوال آگیا تھا؟

اس سوال کا بے تامّل اثبات میں جواب دینے سے پہلے قیاس آرائی کے لئے چند قابل غور پہلو نظر آتے ہیں:-

(۱) اگر یہ مان لیا جائے کہ ہندوستان کی آبادی آہستہ آہستہ

بڑھ رہی تھی تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اُس کے مختلف حصّوں کی جنگی قوّت میں بھی ترقّی ہوی - پس کہہ سکتے ہیں کہ اسی مناسبت سے ان سب کا فتح کرنا بھی دشوار تر ہوتا گیا ؛

(۲) سکندر کے حملے نے ایران و ترکستان کے بادشاہوں کے سامنے گویا ایک نظیر قائم کر دی تھی کہ پھر جو منچلا اُٹھتا وہ اس طرف ضرور یورش کرتا تھا اور گو ان کی فتوحات پائیدار نہ تھیں مگر اس قسم کے حملوں نے غیر قوم والوں کا راستہ صاف کر دیا تھا اور غالباً تیسری صدی قبل مسیح علیہ السلام سے تیسری صدی عیسوی تک اور دوبارہ چھٹی صدی میں ایران و ترکستان کے جتنے گروہ ہند میں آئے، نہ پہلے کبھی آئے تھے نہ (اسلامی فتوحات تک) بعد میں کبھی آکے بسے - ہندوستان کے قدامت پسند باشندوں میں بار بار ان مختلف قوموں کی آمیزش اگرچہ فائدے سے خالی نہ تھی لیکن اس نے قومیت کے نہایت قوی عنصر یعنی اتّحادِ نسل کا ناس کر دیا، جس کے بغیر اس قدیم زمانے میں لوگوں کے خیالات[۱] کا اتحاد محال تھا اور آج بھی کچھ آسان نہیں ہے - اور خیالات کا متّحد ہونا ہر قسم کی قومی یا سیاسی شیرازہ بندی کی پہلی شرط ہے - یہ نہ ہو تو پھر کسی سلطنت یا حکومت میں استحکام آ سکتا ہے نہ کوئی قوم "قوم" بن سکتی ہے - اب اگر ہمارا پہلا نتیجہ، صحیح ہے کہ موریا خاندان کے بعد نووارد قوموں کے آنے سے اہلِ ہند کے خیالات میں سخت انتشار و اختلاف پیدا ہو گیا تھا، تو دوسرا نتیجہ بھی صحیح ہوگا کہ پھر

[۱] اس جگہ لفظ "خیالات" میں محسوسات و جذبات دونوں داخل ہیں ؛

کوئی وسیع و مستحکم سلطنت ہندوستان میں قائم نہ ہو سکتی تھی۔ اس قول کی تائید میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ جب تیسری صدی عیسوی میں تیدیوں یا سیتھیوں کی آمد بند ہوگئی اور ان کے آنے سے جو تلاطم پیدا ہوا تھا اُس کی موجیں ٹھیر گئیں، تو گپت خاندان کی سلطنت قائم ہوی اور جب ہونوں کا سیلاب پھیل کر سوکھ گیا اور خیالات میں کسی قدر یکسوئی ہوی، تو ہرش راجہ کو اپنی سلطنت قائم کرنے کا موقع ہاتھ آیا۔ لیکن چونکہ اب اختلاطِ نسل و خون کی وجہ سے اہلِ ہند میں بے حد اختلافات پیدا ہوگئے تھے، لہذا یہ سیاسی نظام زیادہ عرصے تک نہ چلا اور ہرش کی آنکھیں بند ہوتے ہی اس کی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔

اِن قیاسات کے خلاف مغربی مصنفوں نے بالعموم ہندوستان کے اسبابِ طبیعی کو تمام خرابیوں کی علّت گردانا ہے اور ڈریپر وبکل جیسے نامی انشا پردازوں نے اس بات کو ثابت کرنے میں بڑی بڑی موشگافیاں کی ہیں کہ ممالک ہند کی آب و ہوا کا یہ فطری خاصّہ ہے کہ جو قوم یہاں آکے آباد ہو اُس کے دماغی اور جسمانی قویٰ میں انحطاط پیدا ہو جائے اور وہ عیش دوست اور کاہل بن جائے۔ اور ظاہر ہے کہ پھر ایسی قوم کے افراد سے کسی خاص اوالعزمی دکھانے کی یا وسیع سلطنت قائم کرنے کی امید نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ اشوک و ہرش کی سلطنتوں کی وسعت میں جو فرق تھا اس کا سبب یہی سمجھنا چاہیے کہ اسبابِ طبیعی نے نو وارد آریوں کو رفتہ رفتہ کم ہمت اور ضعیف کر دیا۔

عہدِ ہرش کے ماخذ

بہر حال، آب و ہوا نے اہلِ ہند ہی کو ضعیف و کمزور کر دیا ہو یا آبادی کی افزونی اور اختلافِ نسل و خون کسی بڑی سلطنت بننے کے مانع ہوئے، اس معاملے میں تو ہرش اپنے نامور پیش رَو سے زیادہ خوش نصیب ہے کہ اس کے عہد کی دو کتابیں زمانے کی دست بُرد سے بچ گئیں اور اس کے متعلّق بہت سے حالات محفوظ رہ گئے ورنہ ہندو قوم کو علمِ تاریخ سے جو فطری بیگانگی رہی، اس میں ہرش کے وقت تک کوئی تبدیلی نہ ہوئی تھی۔ ان میں ایک تو اُس کے درباری شاعر بان کی نظم "ہرش چرت" ہے اور دوسری، چینی فاضل ہوئین چوئنگ کا (جو اسی عہد میں سیاحت و زیارت کی غرض سے ہندوستان آیا تھا) سفرنامہ ہے۔ بان کی رزمیہ نظم کو اگر نصرتی کے "علی نامہ" سے تشبیہ دی جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ دونوں شاعروں نے اپنے ممدوح بادشاہوں کے واقعاتِ زندگی شاعرانہ مبالغے کے ساتھ نظم میں لکھے ہیں۔ اس قسم کی ہم عصر تحریریں بے اصل نہیں ہوتیں اور قدیم ہندوستان کی تاریخ لکھنے میں تو وہ خاص کر بہت کار آمد سمجھی جاتی ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ اس میں شاعر اپنے ممدوح کی صرف خوبیاں سراہتا ہے اور اس کے عیوب چھپا لیتا ہے اور چونکہ مکر و سازش سے کوئی کامیابی حاصل کرنا یا کسی کام میں ناکامی بادشاہ کا عیب مانی جاتی ہے، لہٰذا ان چیزوں کو وہ بیان نہیں کرتا۔ "ہرش چرت" کا بھی یہی حال ہے کہ اس میں جو واقعات بیان کئے گئے ہیں اگرچہ وہ سراسر غلط نہیں بلکہ جس

حد تک ہوئین چوانگ کے سفرنامے سے ان کی تصدیق ممکن ہے، ان میں سے اکثر صحیح ہیں تاہم ان کے اصلی اسباب کے متعلق اطمینان نہیں ہوتا اور بہت سے شبہات پیدا ہو جاتے ہیں۔چنانچہ خود ہرش کی تخت نشینی کا جائز ہونا ہی کسی قدر مشتبہ ہے۔

تخت نشینی

اس بارے میں ہم تک جو روایتیں پہنچی ہیں اُن کا خلاصہ یہ ہے کہ جب تھانیسر کے بہادر و جنگجو راجہ پربھاکر کو مرضِ موت لاحق ہوا[۱]، تو اس کے دونوں بیٹے پنجاب کی شمال مغربی سرحد پر ہونوں سے لڑنے گئے تھے۔مگر سپہ سالاری اور جنگ کا اصلی انتظام بڑے بیٹے راج وردھن کے ہاتھ میں تھا، اور غالباً اس کا چھوٹا بھائی ہرش وردھن جس کی عمر اس وقت پندرہ سال سے زیادہ نہ تھی صف جنگ سے بہت پیچھے سیر و شکار میں وقت گزارتا تھا۔یہی وجہ تھی کہ باپ کی بیماری کی اطلاع پہلے اسی کو ہوی اور وہ فوراً تھانیسر پہنچ گیا جہاں تھوڑے ہی عرصے بعد اس کے باپ نے قضا کی اور اہل دربار میں ایک گروہ ہرش وردھن کو راجہ بنانے کی فکر کرنے لگا۔لیکن راج وردھن کے پائے تخت پہنچنے میں دیر نہ لگی اور شاید اس کے پہنچتے ہی اہل سازش کے حوصلے پست ہو گئے تھے کہ اُسے اپنے بہنوئی کا

۱۔ یہ ۶۰۶ء کا واقعہ ہے اور واضح رہے کہ مہرگل کی موت کے بعد سے چھٹی صدی عیسوی کے نصفِ آخر تک تاریخی واقعات بالکل تاریکی میں ہیں۔یعنی اس پچاس ساٹھ برس کے زمانے میں ایک بات بھی ایسی نہیں معلوم ہوسکتی جو تاریخ میں قابل ذکر سمجھی جائے۔۱۲

انتقام لینے مالوے جانا پڑا جہاں کا راجہ اس کے بہنوی کو مار کر بہن راج سری کو گرفتار کر لایا تھا۔ راج وردھن نے قاتل کو شکست دی لیکن دشمن کے فریب میں آکر خود مارا گیا اور تھانیسر کے درباریوں نے "بہت کچھ تامل و تذبذب کے بعد" بادشاہی کے لئے نو عمر ہرش کو منتخب کیا۔ ہرش کو اوّل اوّل اس جلیل القدر منصب کے قبول کرنے میں تردّد تھا اور قبول کرنے کے بعد بھی اس نے کئی برس تک اپنا لقب راجہ کے بجائے "راج پتر" ہی رہنے دیا حالانکہ اس کا سمت اسی وقت سے شروع ہوتا ہے (اکتوبر ۶۰۶ء) تھانیسر کے درباریوں کو اس کے بادشاہ بنانے میں جو تامل تھا اس کا سبب تو ہرش کی کم سنی تھی لیکن ہرش کے تامل کی کوئی معقول وجہ شاعر نے بیان نہیں کی ممکن ہے کہ اس کی وجہ محض انکسار ہو اور یا یہ کہ وہ اتنی اہم ذمّہ داری لیتے ہوئے جھجکتا ہو۔ مگر ایک امکان یہ بھی ہے کہ سلطنت کے دوسرے حق دار موجود ہوں اور ہرش ان کے مقابلے میں "راجہ" بننا جائز نہ جانتا ہو[1]؟

لڑائیاں اور فتوحات

بہر حال، تخت نشین ہوتے ہی اس کا پہلا کام یہ تھا کہ مصیبت زدہ بہن کی تلاش کرے جو قید سے نکل بھاگی اور بندھیاچل کے جنگلوں میں خودکشی پر آمادہ تھی کہ ہرش پہنچ گیا۔ اور اُن مصائب سے نجات پانے کے بعد راج سری کو جو

---

[1] اسمتھ صفحہ ۳۴۸-۳۴۹

عزت اور مرتبہ تھانیسر میں حاصل ہُوا، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک چینی مورّخ نے اس کو ہرش کے ساتھ بادشاہی کا شریک بتایا ہے[1]۔ اسی سلسلے میں ہرش کو بنگالے کے راجہ سے لڑنا پڑا جو مالوے کے راجہ کی طرف سے لڑا اور راج وردھن کے قتل کا اصلی مجرم تھا۔ لڑائی کا نتیجہ معلوم نہیں، مگر قرینہ کہتا ہے کہ اوّل اوّل ہرش کو چنداں کامیابی نہیں ہوی اور اس نے اپنی راج دھانی میں آکر ازسرِنو وہ فوج مرتّب کی جس میں پچاس ہزار پیادہ بیس ہزار سوار اور پانچ ہزار جنگی ہاتھی تھے۔ اس فوج جرّار سے وہ چھ سال تک شمالی ہند میں مسلسل جنگ کرتا رہا حتّیٰ کہ مشرقی بنگالے کے سوا یہ تمام مُلک اس کے زیرِ نگیں آگئے اور اُس نے دکن پر فوج کشی کی تیاری کی۔

اب وہ تمام ہندوستان کو "ایک چھتر کے نیچے" لانے کا آرزو مند تھا۔ اس غرض سے جنگی تیاریاں نہایت وسیع پیمانے پر کی تھیں۔ اور غالباً مفتوحہ ممالک کی ساری دولت اسی جذبۂ کشور کشائی پر نثار کر دی تھی۔ کیونکہ دوبارہ جب وہ میدان میں نکلا تو اس کے جھنڈے کے نیچے ساٹھ ہزار جنگی ہاتھی اور ایک لاکھ شہ سوار جمع تھے کہ جس مُلک پر بڑھے پامال کرتے نکل گئے۔ لیکن شمالی دکن میں اس لشکرِ عظیم نے سخت زک پائی۔ چالوکیہ خاندان کے سب سے نامور فرماں روا پُل کیشن ثانی نے

---

[1] "فانگ چی" مطبوعہ واٹرز۔ جلد اوّل صفحہ ۳۴۵-۱۲

نربدا ندی کے کنارے یہ سیلاب روک لیا اور ہرش کو طوعاً و کرہاً وہاں سے پسپا ہونا پڑا؛ مگر گجرات اور مغربی مالوے میں اس ناکامی کی تلافی ہوگئی جہاں کے راجاوں نے شکستیں کھا کر فاتح کے سامنے سر اطاعت خم کر دیا (۶۴۲ء) دوسرے سال اس نے گنجام (یعنی شمالی کلنگ) پر حملہ کیا اور غالباً یہ آخری فوج کشی تھی جس کے بعد اس نے تلوار ہاتھ سے رکھ دی؛

آخری زمانہ اور ذاتی اوصاف

اس پیہم جنگ و جدال کا ہی ثمرہ تھا کہ ہرش نے اپنی زندگی میں نہایت وسیع سلطنت قائم کر لی جس میں راجپوتانہ و پنجاب کے سوا، نربدا ندی کے اوپر ہندوستان کے تمام زرخیز ممالک شامل تھے۔ لیکن اتنی مشقت اور جفاکشی نے اگر اس کے قوائے جسمانی کو قبل از وقت مضمحل کر دیا ہو تو یہ کچھ تعجب کی بات نہیں۔ اور یہ پچپن، چھپن برس کی عمر میں اس کی وفات (واقعہ ۶۴۸ء) بھی اس بات کا ثبوت ہے۔ شاید یہی سبب تھا کہ اس کے آخری چند سال صرف گیان دھیان اور امن امان کے کاموں میں صرف ہوے اور اس نے اشوک راجہ کی طرح عبادت اور مذہبی خدمت پر کمر باندھی۔ عقائد کے اعتبار سے بھی عمر کے آخری زمانے میں وہ بودھ مت کی طرف مائل ہو گیا تھا گوشت خواری اور جانور کُشی کی اُس نے سختی سے ممانعت کر دی تھی اور ان احکام کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزائے موت دئے بغیر نہ چھوڑتا تھا؛ اس کے دیگر قوانین اور مذہبی جذبات کا حال اس باب کی آخری فصل میں آئے گا، اس جگہ ہرش کے ذاتی اوصاف کے متعلق اتنا لکھنا

ضروری ہے کہ وہ جس طرح رزم کا مردِ میدان تھا اسی طرح بزمِ علم و فضل میں بھی اسے امتیاز حاصل ہے۔ صرف و نحو کی ایک کتاب اور کئی نظموں کی تصنیف اسی سے منسوب کی جاتی ہے۔ اور ایک کتبے میں اس کی خوش خطی کا نمونہ یعنی قلمی دستخط بھی رہ گئے ہیں۔ نظموں میں سب سے بہتر "ناگانند" نامی ڈراما ہے اور اسے قدیم ہندوستان کے سب سے اچھے ناٹکوں میں شمار کرتے ہیں مگر اصل یہ ہے کہ اس بات کا ٹھیک ٹھیک فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ آیا یہ تصانیف واقعی ہرش کی تھیں یا کسی اور شخص نے خوش کرنے کے لئے اس کے نام سے منسوب کر دیں جیسا کہ اکثر ہوا کرتا ہے۔ بایں ہمہ اس کے ذوقِ علمی کی شہادت میں اتنا یقین کے ساتھ معلوم ہے کہ وہ اہل علم کا فیاض مربّی اور مذہبی مباحث کے سننے کا نہایت شوقین تھا۔ اپنے آخری زمانے کے پائے تخت، قنوج، میں اس نے ایک بڑا جلسہ بھی اسی غرض سے کیا تھا کہ وہاں چینی فاضل ہوئین چوئنگ یا ہیون تسانگ بودھمت کے محاسن بیان کرے؛ لیکن اس جلسے کا ذکر کرنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ ہم ہوئین چوئنگ اور اس کی سیاحت ہند کا کچھ حال بیان کر دیں ؛

دوسری فصل۔ ہوئین چوئنگ اور اس کا سفرنامہ

۶۶۲؁ء میں چین کے بادشاہ کاؤتسنگ نے ساٹھ جلدوں

میں ایک کتاب شایع کی تھی جس میں ہندوستان کے متعلق چینی سیّاحوں کی تمام تحریروں کو جمع کیا اور چالیس نقشے لگائے تھے۔ مقدمۂ کتاب اس علم دوست بادشاہ نے اپنے قلم سے لکھا تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ زمانے کی دست بُرد سے یہ کتاب تلف ہوگئی اور اسی کے ساتھ کئی سیّاحوں کے سفرنامے بھی ایسے گُم ہوے کہ اب اُن کے ملنے کی کوئی امّید نہیں ؛ تاہم اس واقعے سے ظاہر ہے کہ ساتویں صدی عیسوی میں (جب کہ چین میں بودھ مت کا بڑا زور تھا) چینیوں کو ہندوستان کی سیاحت اور یہاں کے حالات معلوم کرنے سے نہایت دلچسپی تھی۔اُن کے زائرین میں سے کم از کم چھ ایسے ہیں جن کے پورے یا ادھورے سفرنامے اب تک محفوظ رہے اور ان میں سب سے زیادہ مشہور ہوئین چوئنگ ہوا ہے جس کے سفرنامے سے راجہ ہرش کے زمانے کے بہت سے حالات ہمیں معلوم ہوے ؛

ولادت اور تعلیم

وہ غالباً ۶۰۰ء کے قریب چین خاص کے وسطی صوبے ہونان میں پیدا ہوا اور ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے بڑے بھائی کے پاس پائی جو بودھ مت کی کسی خانقاہ میں درویشانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ سن بلوغ کو پہنچ کر ہوئین چوئنگ نے بھی یہی طرز زندگی اختیار کرلیا اور بہت دن تک تعلیم کے لئے چین کی خانقاہوں میں پھرتا رہا۔ پھر وہ ہونان کے شمالی صوبے (شنسی) کی ایک بڑی خانقاہ میں کچھ عرصے تک مقیم رہا اور یہاں علم و فضل کی بہ دولت اتنی شہرت پائی کہ اب تک اپنے ہم وطنوں میں

"مرشد" یا اُستادِ شریعت کے لقب سے مشہور ہے؛ لیکن وہ اپنے مذہبی علم کو ہندوستان کا سفر کئے بغیر ناقص جانتا تھا اور اسے بودھ مت کا مولد دیکھنے کا بہت ارمان تھا۔ حکومت کی طرف سے اُن دنوں چین کے باہر جانے کی رعایا کو ممانعت کر دی گئی تھی۔ راستے کی دشواریوں سے بھی وہ بے خبر نہ تھا۔ بایں ہمہ زیارتِ ہند کا شوق تمام موانع پر غالب آیا اور ۶۲۹ء میں وہ تنِ تنہا ہندوستان روانہ ہو گیا؛

سیاحت ہند

ہوئین چوئنگ نے اپنے سفر کے حالات اس خوبی سے لکھے ہیں کہ یہ سفرنامہ چینی زبان کے علم ادب میں نہایت ممتاز حیثیت رکھتا ہے اور اس کا فرانسیسی ترجمہ نہ صرف تاریخی معلومات بلکہ ادبی خوبیوں کے لحاظ سے بھی بہت قابل قدر مانا جاتا ہے، اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ ہمارے فاضل سیاح نے اپنے مشاہدات کے ساتھ محض سنی سنائی یا معمولی روایتیں جمع نہیں کر دی ہیں بلکہ جو کچھ لکھا ہے وہ کافی تحقیقات اور غائر نظر ڈال کے لکھا ہے؛ ہندوستان میں وہ ترکستان و کابل کے راستے ۶۳۰ء میں پرش پور (پشاور) پہنچ گیا تھا مگر وادیٔ سندھ و کشمیر کی خانقاہوں میں تعلیم و زیارات نے دو برس لئے اور وہ ۶۳۳ء سے قبل ہندوستان خاص کے علاقے میں نہ پہنچ سکا یہاں اس نے سب سے پہلے متھرا اور تھانیسر کی سیر کی۔ پھر گنگا کے کنارے کنارے قنوج تک آیا جو اُن دنوں شمالی ہندوستان کا نہایت بارونق صدر مقام تھا؛ قنوج سے چل کر اُس نے بودھ مت کے مشہور مقامات کا اس طرح

دورہ لگایا کہ اُجدھیا، پریاگ، کوشمبی، اور شمال میں سراوستی، کپل وستو، غرض کوئی ایسا شہر اس کی سیاحت سے نہ بچا جس میں گوتم بودھ کی کوئی یادگار موجود تھی۔ اور آخر میں گیا اور پٹنے ہوتا ہوا شہر نالندا پہنچ گیا جہاں اس زمانے میں بودھ مت کی بہت بڑی درس گاہ تھی۔ اس درس گاہ میں دو سال تک زبان سنسکرت اور اپنے مذہب کے دقیق مسائل کی تعلیم حاصل کی پھر شمال میں اسام (کامروپ) اور جنوب میں ساحل کلنگ کے مشہور مقامات کی سیاحت کی پھر ۶۴۰ء کے قریب مہاراشٹر کرناٹک، مالوے میں گھومتا ہوا غالباً دوبارہ بہار کے علاقے میں آیا اور یہاں اس کی ہرش راجہ سے ملاقات ہوی جس کا حال آگے آتا ہے۔ اِس کے بعد گجرات اور سندھ کے راستے وہ غزنی پہنچ گیا اور ۶۴۴ء میں اپنے وطن کو اسی راہ سے مراجعت کی جس سے ہندوستان آیا تھا۔

واپسی اور وفات

لیکن اب وہ تنہا یا گمنامی کی حالت میں نہ تھا بلکہ بہت سے شاگرد، کتابوں کا ذخیرہ، قیمتی تصاویر اور نادر تبرکات اس کے ساتھ تھے اور چین کے جس شہر میں پہنچتا تھا بڑی دھوم سے اس کا استقبال ہوتا تھا۔ خود بادشاہ نے اس کی بڑی عزت اور مدارات کی اور یہ بھی چاہا کہ خرقۂ درویشی اتار کر اب وہ خلعتِ امارت پہن لے اور سلطنت کی خدمت کرے۔ لیکن ہوئین چوئنگ نے یہ درخواست قبول نہیں کی بلکہ اپنی پہلی خانقاہ (واقعہ صوبہ شنسی) میں چلا آیا۔ البتہ بادشاہ کے کہنے سے اُس نے

اپنے سفر کے حالات قلم بند کر دیئے اور یہ دلچسپ کتاب ۶۴۸ء میں تکمیل کو پہنچی۔ ہندوستان سے جو سنسکرت کتابیں ساتھ لایا تھا ان میں سے کئی کا چینی میں اس نے ترجمہ بھی کیا اور باقی تمام وقت اسی قسم کے علمی اور مذہبی مشاغل میں گزار کر ۶۶۴ء میں وفات پائی ؛

راجہ ہرش سے ملاقات

ہندوستان میں اس کی ملاقات راجہ ہرش سے بھی ہوی تھی اور سچ یہ ہے کہ اسی کی بہ دولت ہمیں اس زمانے کے بہت کچھ حالات معلوم ہو سکے ورنہ عہد ہرش کی کوئی باقاعدہ تاریخ نہیں لکھی گئی تھی ؛ یہ راجہ اُن دنوں اپنے جنگی مشاغل سے قریب قریب دست کش ہوگیا تھا اور ہوئین چوئنگ کی ملاقات کے بعد شاید ایک ہی لڑائی اور لڑا، کیونکہ یہ ملاقات ۶۴۳ء کے آغاز میں ہوی تھی۔ غالباً وہ ان دنوں اپنے مشرقی صوبوں کا دورہ کر رہا تھا اور اسی سفر میں ہوئین چوئنگ کو باریابی کی عزت حاصل ہوی۔ پھر جب اس کی عالمانہ تقریریں سُنیں تو راجہ اس پردیسی سیاح کا گرویدہ ہوگیا اور اس نے کئی مرتبہ علمائے ہند کے ساتھ اس کے مناظرے کرائے۔ معلوم ہوتا ہے، ان مناظروں میں راجہ علانیہ اپنے چینی مہمان کی طرفداری کرتا تھا اور اس کی انہی عِنایتوں نے ہوئین چوئنگ کو اتنا محسود بنا دیا کہ بعض غیر مذہب والے اس کی جان لینے کے درپے ہوگئے۔ یہ سن کر راجہ نے یہ عتاب آمیز اعلان شایع کیا کہ اگر "استاد" کو کسی نے ضرر پہونچایا تو قتل کی سزا پاے گا اور اس کی شان میں کوئی بُرا لفظ بھی زبان سے نکالا تو زبان کٹوا دی جائے گی!

پھر ہرش نے اس غرض سے کہ اس چینی فاضل کی لاجواب تقریر سے اور لوگ بھی مستفید ہوں قنوج میں ایک بڑی مجلس منعقد کی جس میں کئی ہزار بودھ، برہمن اور چینی علماء مدعو تھے۔ چونکہ راجہ کے پنجسالہ جشن کا زمانہ قریب تھا اس لئے سب خراج گزار راجہ مہاراجہ بھی بلائے گئے اور اوّل قنوج میں ان کا مجمع ہوا۔ یہاں کوئی پچاس ہاتھ اُونچے مینار پر گوتم بودھ کی طلائی مورت نصب کی گئی تھی۔ اس کی دوسری چھوٹی مورت کا بڑی دھوم دھام سے جلوس نکالا گیا جس میں ہرش نے سکر دیوتا کے لباس میں چتر برداری کی اور اس کے حلیف راجہ والئ کامروپ نے برہما کے لباس میں مگس رانی کی خدمت انجام دی۔ باقی راجہ مہاراجہ ہاتھیوں پر سوار جلو میں چل رہے تھے۔ چلتے میں راجہ ہرش دنیا کے تین انمول "جواہرات" (یعنی گوتم[1]، اس کی شریعت[2] اور اس کی ملّت[3]) کے نام پر موتی اور سونے کے پھول نچھاور کرتا جاتا تھا۔ اور بودھ مت کا یہ اتنا بڑا اعزاز تھا کہ اس شان و شوکت کو دیکھ کر برہمنوں کے دل میں نفرت و حسد کی آگ بھڑکنے لگی۔

جہاں گوتم کی بڑی مورت کے واسطے مینار بنایا گیا تھا وہیں صرفِ کثیر سے ایک ہنگامی خانقاہ بھی تیار کرا لی تھی۔ یہ جلسۂ عظیم ابھی پوری طرح ختم نہ ہوا تھا کہ برہمنوں کی سازش سے اس خانقاہ میں آگ لگی اور بہ مشکل بجھائی جا سکی۔ پھر خود ہرش پر ایک شخص نے قاتلانہ حملہ کیا مگر اپنے ارادے میں کامیاب نہ ہو سکا اور گرفتار کر لیا گیا۔ اُس نے اپنے جُرم کا اقبال کر لیا اور پانچ سو بڑے

بڑے برہمن جو اس سازش میں شریک تھے حراست میں لے لئے گئے۔ ان میں سے بعض کو موت کی سزا ملی اور باقی جلا وطن کر دیئے گئے۔

ہوئین چوئنگ کی رخصت

ان واقعات سے یہ بہ آسانی سمجھ میں آ سکتا ہے کہ اس عظیم الشان جلسے کا خاتمہ بے لطفی کے ساتھ ہوا ہوگا۔ یوں بھی ہمارے چینی سیاح کو وطن چھوڑے تیرہ برس ہو گئے تھے اور اب وہ جلد سے جلد رخصت ہونا چاہتا تھا مگر اپنے قدردان میزبان کی خاطر اسے چند روز اور ٹھیرنا پڑا کہ اُس پنج سالہ جشن میں شرکت کر سکے جو گنگا جمنا کے سنگم پر منعقد ہونے والا تھا۔ اس جشن میں ہرش نے ہر مذہب کے علماء اور فقرا کو دل کھول کر دان دیا اور کئی ہفتہ تک یہ لوگ بادشاہ کے مہمان رہے آخر میں ایک مہینے تک ہر مذہب و ملت کے مساکین و یتامیٰ کو خیرات تقسیم ہوتی رہی حتّٰی کہ ہرش کا تمام خزانہ خالی ہوگیا، اُس نے اپنے زیورات و ملبوسات بھی محتاجوں کو دے دیئے اور آخر میں اپنی بہن سے کپڑا مانگ کر پہنا اور "دیوتاؤں کے حضور میں سجدۂ شکر ادا کیا کہ جو کچھ میرے پاس تھا آج کے دن دین کی خدمت میں خرچ ہو گیا"

ان تمام مراسم سے فارغ ہونے کے بعد اس نے ہوئین چوئنگ کو بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ رخصت کیا۔ وہ اور اس کا حلیف راجہ کامروپ "استاد" کو بہت سے تحائف دینا چاہتے تھے مگر ہوئین چوئنگ نے زادِ راہ کے سوا کوئی چیز قبول

نہ کی اور اپنا بڑا خزانہ یعنی تبرکات کے صندوق اور سنسکرت کتابوں کے ۶۵۰ قلمی نسخے لے کر وطن روانہ ہوگیا ؛

تیسری فصل۔ اس عہد کے عام حالات

ذاتی سوانح سے قطع نظر، ہوئین چونگ کا سفرنامہ (''فوکوی کی'') اس عہد کے نظم و نسق اور مذہب و تمدن کی اگرچہ مختصر مگر نہایت معتبر تاریخ ہے۔ چونکہ ہرش کے بعد شمالی ہند میں طوائف الملوکی کا دور دورہ ہوگیا اور مسلمانوں کے آنے تک کوئی ایسی بڑی سلطنت قائم نہیں ہوی جس کے مفصل یا دلچسپ حالات موجود ہوں لہٰذا ہندی تمدن کی اس آخری تصویر پر ایک نظر کرنا نہایت ضروری ہے اگرچہ اس کے خط و خال اتنے واضح نہ ہوں جتنے اس زمانے کے نقاد چاہتے ہیں ؛

معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے نظم و نسق کے پرانے طریقوں میں کوئی فرق نہ آیا تھا اور یہ امر محض قدامت پرستی کی دلیل نہیں بلکہ اس بات کی شہادت ہے کہ حکومت کے جو سیدھے سادے اصول موریا خاندان کے زمانے سے بندھ گئے تھے وہ ہزار برس بعد بھی راعی و رعایا دونوں کی ضروریات کے لئے مناسب تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان جیسے زرعی ملک کے تمدن ہی میں عرصۂ دراز تک کوئی تغیر نہیں ہوتا۔ اپنے گانوں میں ہر شخص ذاتی محنت اور گانوں والوں کی تھوڑی سی مدد سے ملکی نظم و نسق

معاش کا سامان فراہم کر لیتا ہے۔ اُس کی دیہاتی ضروریات کے لئے زمین کی پیداوار اور دیہاتی دستکار کی مصنوعات کافی ہو جاتی ہیں۔ اس کی دنیا بہت محدود ہے اور وہ اسی میں قناعت و استغنا کے ساتھ اپنی زندگی گزار دیتا ہے۔ گاؤں سے باہر جانے کی یا اپنی برادری کے سوا دوسرے لوگوں سے میل جول کی اسے بہت کم ضرورت پڑتی ہے۔ لہذا اس کے لئے وضع قوانین کی مجلسوں اور نت نئے ضابطوں کی بھی حاجت نہیں "

مختصر یہ کہ جہاں لوگوں کا تمدن نہ بدلے وہاں نظم و نسق کے پرانے آئین بدلنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ البتہ جہاں حکومت کی باگ مطلق العنان بادشاہوں کے ہاتھ میں ہو، وہاں بادشاہ کی ذاتی قابلیت یا نا اہلی کا ملکی نظم و نسق پر بڑا اثر ہوگا۔ اور جب ہم یہ پڑھتے ہیں کہ ہرش نہایت مستعد فرماں روا تھا اور اپنے دُور دست صوبوں میں اکثر دورے کرتا رہتا تھا تو ہوئین چوئنگ نے ہندوستان کے نظم و نسق کی جو تعریفیں کی ہیں، اُن کے نہ ماننے کی کوئی وجہ نہیں رہتی۔ یہ ضرور ہے کہ فاہیان چینی کے زمانۂ سیاحت میں راستے جس قدر محفوظ تھے، اب وہ بات نہ رہی تھی اور ہیوئین چوئنگ کو کئی جگہ رہزنوں نے لوٹا۔ لیکن اس کی بڑی وجہ تو یہ ہوگی کہ ہرش سے پہلے ملک میں بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستیں خود مختار تھیں اور آپس میں جنگ و جدال کے باعث ضرور ہے کہ سخت بدنظمی اور بد امنی پھیلی ہوی ہو۔ مگر دوسرا سبب آبادی کی کثرت اور وسائلِ معاش کی قلت کو قرار

دے سکتے ہیں کیونکہ ہرش کی فوج میں لاکھوں آدمیوں کے بھرتی ہو جانے سے خیال ہوتا ہے کہ شاید زراعت میں کمی اور اجناس میں گرانی ہوگئی ہو اور ادھر نو مفتوح ملکوں مین جو سپاہی اب بیکار ہو گئے تھے، انہوں نے رہزنی کا پیشہ اختیار کر لیا ہو۔ بایں ہمہ دیگر سنگین جرائم کی کمی تھی اور بعض اوقات چھوٹے چھوٹے قصور پر بھی نہایت سخت سزائیں دی جاتی تھیں تو تحقیقاتِ جرائم کا یہ پرانا طریقہ ابھی تک رائج تھا کہ ملزم کو آگ میں ڈال دیتے یا زہر کھلا دیتے اور اگر اس پر کوئی اثر نہ ہو تو گویا اس کی بے گناہی ثابت ہو جاتی تھی۔

مداخلِ شاہی کا جزوِ اعظم مالگذاری کا روپیہ تھا اور اُصولاً زمیندار یا کاشتکار سے پیداوار کا چھٹا حصہ سرکار وصول کر لیتی تھی۔ دیگر محصولات بہت کم تھے اور عمّال شاہی کو لوگوں کے تنگ کرنے کا زیادہ موقع نہ ملتا تھا۔ ان عمّال کو تنخواہوں کی بجائے سرکار کی طرف سے جاگیریں عطا ہو جاتی تھیں اور ہوئین چوئنگ نے لکھا ہے کہ وقائع نویسوں کا بھی ایک محکمہ قائم تھا۔ یعنے ہر صوبے میں چند عہدہ دار اس کام پر مامور ہوتے تھے کہ "آفات ارضی و سماوی اور واقعاتِ نیک و بد" اپنی کتاب میں درج کرتے رہیں۔ افسوس ہے کہ اس قسم کی کتاب کا کوئی نمونہ محفوظ نہیں ورنہ اہل تاریخ کے لئے اُس عہد کی بہترین یادگار ہوتا۔

علوم و فنون — راجہ ہرش اور اسی کی طرح دوسرے رئیس و راجہ اہل علم کے بڑے قدردان تھے اور علماء کی ہر جگہ عزت کی جاتی تھی۔

اس بات کی بھی شہادت ملتی ہے کہ برہمنوں میں اور بودھ مت کے فقرا میں تعلیم اور علم کا شوق عام تھا۔ بایں ہمہ اس عہد کی شاید ہی کوئی تصنیف ایسی ہوگی جسے سنسکرت کے علم ادب میں نمایاں جگہ دی جائے۔ ریاضی و ہیئات میں بھی جس کا ہندوؤں کو قدیم سے بہت شوق رہا، اس زمانے کی کوئی علمی یادگار نہیں اور مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اُن کے علوم کی حالت زوال پذیر نظر آتی ہے۔

فنون میں سوائے بُت تراشی کے کسی فن کی ترقی کا ثبوت نہیں ملتا۔ اس زمانے کی تصاویر تو اب محفوظ نہیں کہ فنِ نقاشی کی ترقی یا تنزّل کا صحیح اندازہ کیا جا سکے لیکن جو سکّے موجود ہیں اُن سے پایا جاتا ہے کہ کم سے کم یہ صنعت (ضرب سکہ) رُو بہ زوال تھی حتیٰ کہ "قرونِ وسطی کا ایک سکّہ بھی خوبیٔ صنعت کی بنا پر قابلِ ذکر نہیں[1]" البتہ ایک بُت تراشی ایسی صنعت ہے جس کو اس زمانے میں بہت فروغ حاصل ہُوا، اور چھٹی ساتویں صدی عیسوی میں جس کثرت سے بُت بنے شاید پہلے کبھی نہ بنے تھے۔ اس کا سبب ظاہر ہے کہ یہی زمانہ "بت پرستی" کے بڑے عروج کا زمانہ تھا۔ راجہ سے پرجا تک ہر طبقے اور ہر فرقے کے لوگ مورتی پوجا کے گرویدہ تھے حتیٰ کہ بودھ مت اور جین مت کے پیشواؤں کو بھی اس طریقے کے اختیار کئے بغیر چارہ نہ رہا تھا

---

[1] و، اسمتھ۔ صفحہ ۳۵۸

اور عہدِ ہرش میں یہ صنم پرستی جس زور و شور اور شان کے ساتھ ہوتی تھی اس کی ایک مثال پچھلی فصل میں ہماری نظر سے گزر چکی ہے[1]۔

مذہب اور اختلافات

اس طرح ہر فرقے میں بت پرستی پھیل جانے سے خیال ہوتا ہے کہ اُن دنوں ہند کے مختلف مذاہب میں کم سے کم اتحاد کا ایک قوی عنصر پیدا ہوگیا ہوگا اور اُن میں ایسا مذہبی اختلاف نہ ہوگا جو شدید عداوتِ باہمی کی صورت اختیار کرلے۔ کیونکہ بُت پرستی کا مشرب یقیناً نہایت وسیع ہوتا ہے اور ہوئین چوئنگ نے ہرش کے خاندان یا دربار والوں کے مذہب کی نسبت جو کچھ لکھا ہے اس سے بھی مذکورۂ بالا قیاس کی تائید ہوتی ہے کہ ان میں کوئی تو شِو کا پرستار تھا اور کوئی بودھ مت کا پیرو ہوگیا تھا۔ بعض لوگ سورج کی پوجا کرتے تھے بعض وِشنو کی۔ غرض ہر شخص آزاد تھا کہ جس دیوی دیوتا کو چاہے اپنی پرستش کے لئے مخصوص کرلے اور چاہے تو سب کی پوجا کرے، کوئی تعرض نہ کرتا تھا۔ لیکن اس رواداری کے باوجود معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو جو اب پرانوں کو اپنی کتبِ مقدسہ ماننے لگے تھے بودھ مت والوں سے شدید نفرت تھی اور اس کا کبھی کبھی اظہار کشت و خون کی صورت میں ہوتا تھا۔ ہرش کے بڑے بھائی کو بنگالے کے جس راجہ نے دغا سے مارا اسی کی نسبت مشہور ہے کہ بودھ مت کا بڑا دشمن تھا

---

[1] دیکھو ضمیمہ باب ہذا۔ ۱۲

اور اُن کی خانقاہیں منہدم کرا کے بھکشوں کو طرح طرح کے آزار پہنچاتا تھا۔ اُس نے گیا میں اُس بڑ کے درخت کو بھی کھدوا کے آگ میں جلا دیا تھا جس کے نیچے گوتم کو عرفان حاصل ہُوا اور جو بودھ مت والوں کی سب سے مقدس زیارت گاہ بن گیا تھا۔ بارے کچھ عرصے بعد ایک اور مگدھ کے راجہ نے از سرِ نو اسے نصب کیا اور کہتے ہیں کہ وہی اشوک راجہ کی نسل میں مگدھ کا سب سے آخری فرماں روا گزرا ہے "۔

خود راجہ ہرش آخر میں بودھ مت کا سرگرم پیرو اور اس لئے برہمنوں کا محسود بن گیا تھا۔ مگر اس نے اوّل اوّل جو مذہبی خدمات انجام دیں وہ عام تھیں اور ان میں کسی خاص فرقے کا لحاظ نہیں رکھا تھا۔ چنانچہ قصبات و دیہات میں بہت سے دھرم سالے بنائے تھے جن میں ہر مذہب و ملت کا مسافر قیام کر سکتا تھا۔ سرکاری خرچ سے اس کی مہمانی اور بیمار ہو تو باقاعدہ علاج کیا جاتا تھا۔ اسی طرح بادشاہ کی طرف سے متعدد مندر تعمیر کرا دیئے گئے تھے جن میں سے بعض بودھ مت والوں کے لئے تھے اور بعض میں ہندوؤں کے دیوتاؤں کی پوجا ہوتی تھی۔ گنگا جمنا کے سنگم پر پانچویں سال ایک عام جشن شاہی ہوتا تھا اور اس میں بھی بلا تخصیص، ہر مذہب کے مساکین و فقرا کو دریا دلی سے خیرات تقسیم کی جاتی تھی "۔ البتہ اپنے آخری عہد میں یہ بادشاہ علانیہ بودھ مت کا طرفدار ہوگیا تھا اور خزانۂ شاہی کا بہت سا روپیہ اسی مذہب کی خانقاہیں اور "ستوپے" یعنی گنبد بنانے میں صرف ہونے لگا تھا

چنانچہ ایسی کئی ہزار عمارتوں کی تعمیر اسی سے منسوب ہے - اور
ونسنٹ اسمتھ لکھتا ہے کہ "گو ہوئین چوئنگ کی سیاحت اور ہرش
کے زمانے میں بودھ مت نمایاں طور پر رُو بہ زوال تھا بایں ہمہ
اس کے بھکشو ابھی تک تعداد کثیر میں موجود تھے - چنانچہ ہمارے
سیّاح نے ان خانقاہوں میں رہنے والے درویشوں کی تعداد دو لاکھ
کے قریب بتائی ہے اور ظاہر ہے کہ اس تعداد کثیر کی پرورش میں
شاہانہ فیاضی اور دریا دلی دکھانے کا میدان بھی بہت وسیع تھا"
ارلی ہسٹری (صفحہ ۳۴۵)

ضمیمہ باب نہم

ہندوؤں کی آخری مذہبی کتابیں

پُرانوں کے متعلق مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ سنسکرت زبان کے مشہور ماہر جولیس اِگلنگ (پروفیسر اڈن برو یونیورسٹی) کی مستند تحریر پر اکتفا کی جائے جنھوں نے "سنسکرت" پر انسائی کلو پیڈیا (طبع جدید) میں نہایت محققانہ مضمون لکھا ہے؛ (جلد ۲۴ صفحہ ۱۵۶ تا ۱۸۲)

پروفیسر موصوف ولسن کی کتاب "مذہب ہنود" کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ "پران کائنات کی فلسفیانہ مگر افسانہ آمیز تاریخیں ہیں اور ان کو برہمنوں کے مختلف اور خاص خاص مقامی عقائد کی تائید میں جمع کیا گیا ہے۔ بعض اوقات انہیں "پانچویں وید" کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور درحقیقت ان کو ہندوستان کے برہمنوں کی کتبِ مقدسہ سمجھنا ایک حد تک بالکل صحیح ہوگا۔ یہ لفظ (پُرانڑ) جس کے معنی پُرانے کے ہیں اوّل اوّل ایسے ماقبلِ تاریخ افسانوں کے لئے استعمال ہوتا تھا جن میں خاص کر موجودات کے خلق ہونے کا بیان ہو۔ لیکن بعد میں ہر قسم کی پرانی روایات کے مجموعے پر اس کا اطلاق کرنے لگے؛ ایسے مجموعوں میں جو اس وقت موجود ہیں، اگرچہ برہمنوں کے اصولی عقیدے "تری مورتی" یعنی ذاتِ باری تعالےٰ کی

تین صورتیں (پیدا کرنے والا' برہما۔ پالنے والا' وشنو۔ فنا کرنے والا' شیو) تسلیم کی گئی ہیں' لیکن دراصل تاریخی دلائل سے' خاص خاص فرقے یا مقام کے کسی دیوی دیوتا کی عظمت دل نشین کرنا' ان کا مقصود ہے۔ اور اس غرض کو پورا کرنے کے لئے تالیف کرنیوالوں نے ہر قسم کا تاریخی اور فلسفیانہ مسالا جمع کر دیا ہے جس کی بہ دولت یہ کتابیں علم معلومات کا نہایت عمدہ ذخیرہ بن گئی ہیں۔ مختلف شواہد سے یہ بات بہ خوبی ثابت ہے کہ موجودہ پران قدیم نسخوں سے یا تو صرف ماخوذ ہیں یا بعد کے الحاقات سے اصلی کتابوں کو بہت بڑھا لیا گیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ موجودہ پرانوں میں سے کوئی بھی ایک ہزار سال سے زیادہ زمانے کا نہیں ہے گو ان کے بعض حصے نہایت قدیم بلکہ عجب نہیں کہ ولادت مسیح علیہ السلام سے بھی کئی صدی قبل کے ہوں۔"

قصص و روایات کا جہاں تک تعلق ہے پرانوں کا مضمون سنسکرت کی رزمیہ نظموں خاص کر "مہا بھارت" سے ملتا جلتا ہے۔ اور بہ ظاہر احوال پرانوں اور ان نظموں کے اصلی مؤلفین اور بعد کے ناقلین دونوں گروہوں نے انہی کثیر روایتوں کی بنیاد پر اپنی کتابیں مرتّب کی ہیں جو عام طور پر زبان زد اور کم و بیش ہوتی رہتی تھیں۔ دوسرے قریب قریب تمام پران انہی بحروں میں بیانیہ مثنوی کے طرز پر لکھے گئے ہیں' اگرچہ مجموعی طور پر شاعری کے لحاظ سے وہ ان رزمیہ نظموں سے بہت کم رتبہ ہیں۔"

روایتِ عام کی رو سے اٹھارہ مہاپُران ہیں اور اٹھارہ اُپ پُران (اُپ بمعنے ماتحت یا خُرد) اور مہاپرانوں کے تین مجموعے کر دئے ہیں۔ پہلے مجموعے کے چھ[1] مہاپرانوں میں وشنو کے اور چھ[2] کے دوسرے مجموعے میں شوجی کے بھجن ہیں۔ مگر تیسرے مجموعے میں برہما کی بجائے کرشن، گنیش، سوریا، وغیرہ اوتاروں کے قصے لکھے ہیں اور پروفیسر بنرجی کا خیال ہے کہ اس مجموعہ میں زیادہ تر الحاقی کلام ہے۔ بہر حال ان سب مہاپرانوں میں کل چار لاکھ شعر ہیں اور اُپ پران یا ستھل پران، جن میں دیوی دیوتاؤں کے استھانوں کی تاریخ بیان کی ہے ان کے علاوہ ہیں گو یہ اتنے وقیع نہیں۔

---

[1] ان پہلے چھ کے نام یہ ہیں:۔ وشنو[1] ناردیئے[2] بھگوت[3] ۔ گارود[4] ۔ پدما[5] ۔ وراہا[6]۔ مگر نہ صرف اس مجموعے میں بلکہ تمام پرانوں میں سب سے زیادہ مقبول بھگوت پران کو مانا جاتا ہے اور اسی کا عام عقائد پر بہت اثر پڑا ہے۔

[2] ان چھ کے نام یہ ہیں:۔ متسی ۔ کورما ۔ سکندا ۔ لنگ ۔ شِو ۔ اگنی۔

باب دہم

پہلی فصل - آزاد سرحدی ریاستیں

ہرش کی وفات کے بعد ہندوستان خاص میں جو آزاد ریاستیں قائم ہوی تھیں اُن کا اور بعض راجپوت قبائل کا ذکر کرنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ ہم اُن ریاستوں کا کچھ حال تحریر کر دیں جو عہد ہرش سے بیشتر ہی خود مختار ہوگئی تھیں - پنجاب کی دو ایک چھوٹی ریاستوں کو چھوڑ کر، سندھ و کشمیر، نیپال و کامروپ (یا اسام) وہ علاقے ہیں جنھیں صحیح معنی میں اب تک ہندوستانی کہنا دشوار ہے - قدیم زمانے میں جب کہ آمد رفت کے جدید وسائل نہ تھے، ان بعید علاقوں کا ہندوستان خاص کی سلطنت سے علیٰحدہ ہو جانا کچھ بھی تعجّب کی بات نہیں - چنانچہ سلطنت مُغلیّہ کے استقلال سے پہلے ان میں صدیوں سے خود مختار حکومتیں قائم تھیں، سوائے سندھ کے جسے محمود غزنوی اور پھر شاہان دہلی نے کئی بار فتح کیا - بایں ہمہ اس پر بھی اکبر کے زمانے سے قبل ہندوستان کے بادشاہوں کو کامل تسلط حاصل نہ ہو سکا تھا ؛

سندھ

غرض ہیوئین چوئنگ جب ہندوستان آیا تو سندھ میں ایک قوی اور خود مختار سلطنت قائم تھی - صوبۂ بلوچستان اس کا مقبوضہ تھا اور دریاے سندھ کی تمام وادیِٔ زیریں اُس میں داخل تھی -

پنجاب اور مُلک سندھ کے درمیان ان دنوں ہکرا ندی حدِ فاصل تھی جواب سوکھ گئی ہے مگر ساتویں صدی عیسوی تک سندھ کا صدر مقام ارور یا الور اسی کے بائیں کنارے پر موجودہ شہر خیرپور سے چند میل شمال میں واقع تھا۔ اس آزاد سلطنت کے متعلق سب سے زیادہ قابل ذکر بات یہ ہے کہ وہاں شودر ذات کے راجہ حکومت کرتے تھے اور اُن کا مذہب بودھ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس مذہب کا یہاں زور تھا اور ہوئین چوئنگ آیا ہے تو بودھ مت کے تقریباً دس ہزار علماء یا درویش سندھ میں رہتے تھے۔ لیکن ہمارے چینی سیّاح نے اُن کے اخلاق و اطوار کی مذمّت کی ہے اور لکھا ہے کہ یہ مذہبی پیشوا عام طور پر نکمّے اور عیش دوست ہیں۔

راجہ ہرش کا ہم عصر سندھ میں سہراس رائے تھا اور مسلمانوں نے اس ملک پر سب سے اوّل اسی زمانے میں حملہ کیا۔ یہ نوخیز قوم جنوبی ایران کو فتح کر کے اِدھر بڑھی تھی۔ سہراس رائے نے روکنا چاہا مگر لڑائی میں شکست کھائی اور مارا گیا۔ پھر اس کے بیٹے ساہسی نے عرب فاتحین کے مقابلے کی تیّاریاں کیں اور دو سال بعد اپنے باپ کی مثل شکست کھا کے میدان میں کام آیا۔ مکران پر جو بلوچستان کا جنوب مغربی صوبہ ہے مسلمانوں کا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے آخری ایّام خلافت یعنے ۶۴۴ء ہی میں مستقل قبضہ ہوگیا تھا لیکن سندھ خاص کی فتح عرصے کے بعد ہوی جب کہ شودر خاندان کی بجائے وہاں برہمنوں کا

ایک خاندان برسرِ حکومت تھا[1] اس خاندان کا مورث (بچچ) اصل میں راجہ ساہسی کا وزیر تھا۔ جب وہ راجہ مارا گیا تو خود بادشاہ بن بیٹھا اور چالیس برس تک حکومت کی۔ اسی کا بیٹا راجہ داہر تھا جس کے عہد میں سندھ کو عربوں نے فتح کرلیا۔ (۷۱۲ء)

کشمیر پروفسر وِلسن کا قول ہے کہ سنسکرت زبان کی جس قدر کتابیں اب تک دستیاب ہوی ہیں، ان میں صرف راج ترنگنی ایسی کتاب ہے جس کو تاریخ کہنا ایک حد تک جائز ہوگا[1] ہم اپنی کتاب کے شروع میں اس کا حوالہ دے آئے ہیں کہ یہ کتاب شاہانِ کشمیر کے حالات میں لکھی گئی تھی۔ اس کا پہلا حصہ بارھویں صدی کے وسط میں کلہن نامی مصنّف نے تحریر کیا پھر کشمیر کے اسلامی بادشاہوں کے عہد میں اس کی تکمیل (۱۴۸۶ء میں) ہوی اور جب یہ مُلک فتح ہوکر سلطنت مغلیہ میں شامل ہوا تو اکبر بادشاہ کے حکم سے راج ترنگنی کا ترجمہ فارسی زبان میں کرایا گیا اور اسی کا خلاصہ ابوالفضل نے اپنی کتاب "آئینِ اکبری" میں درج کیا ہے۔

لیکن اس کتاب میں بھی ساتویں صدی عیسوی سے پہلے کے صحیح حالات نہیں ملتے جس پر اعتبار کیا جا سکے حالانکہ کشان خاندان میں زوال آنے کے بعد تیسری صدی عیسوی سے یہ

---

[1] انسائی کلو پیڈیا جلد ۱۵۔ صفحہ ۶۸۸ و ۶۸۹

ریاست غالباً خود مختار ہو گئی تھی - ہوئین چوئنگ جب یہاں آیا
ہے تو اس میں کابل و گندھارا یعنی شمال مغربی پنجاب کا
پہاڑی مُلک بھی شامل تھا اور بودھ مت کی بہت سی خانقاہیں
تھیں[1] - چنانچہ وہ دو سال تک اس ملک میں سیاحت کرتا رہا
(۶۳۱ء تا ۶۳۳ء) بادشاہِ وقت نے ہوئین چوئنگ کا جو اعزاز
و اکرام کیا اس کا وہ معترف ہے لیکن اپنے سفرنامے میں
اس کے نام کا کہیں ذکر نہیں کرتا - ونسنٹ اسمتھ صاحب کا
خیال ہے کہ غالباً وہ "کرکوٹ" خاندان کا پہلا راجہ دُرلبھ وردھن
(Durlabhavardhana) ہوگا جو ہرش کا ہمعصر گزرا
ہے اور عرصۂ دراز تک حکومت کرتا رہا: معلوم ہوتا ہے اس راجہ
کے تیسرے جانشین کے زمانے میں ریاست کشمیر سلطنت چین
کی باج گزار ہو گئی تھی چنانچہ آٹھویں صدی کے کشمیری راجہ
بادشاہ چین سے خلعتِ حکومت پاتے تھے - انہی راجاؤں میں
لِلتادِت (Lalitaditya) خاص طور پر قابل ذکر ہے
جس نے ۷۴۰ء کے قریب قنوج کے راجہ کو شکست دی اور
وادیِ سندھ کی کئی شمالی قوموں کو مغلوب کیا - للتادت کی ایک
یادگار "مارتاند" (یعنی سورج دیوتا) کا مندر، شہر اسلام آباد سے
تین میل کے فاصلے پر اب تک سلامت ہے اور کشمیر کے فنِ
تعمیر کی امتیازی خصوصیات دکھاتا ہے: واضح رہے کہ اسلام آباد

---

[1] انسائیکلو پیڈیا جلد ۱۵ - صفحہ ۶۸۸ و ۶۸۹

جس کا قدیم نام انت ناگ ہے کشمیر کی آزاد ریاست کا پائے تخت تھا؛

شاہانِ کشمیر کے مظالم

اس راجہ کے پوتے ونیادت کی فتوحات کے بہت سے قصے راج ترنگنی میں نقل کئے ہیں۔ مگر ان میں بہت مبالغہ معلوم ہوتا ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ انہی مشرقی اور ہندوستانی فتوحات نے اس راجہ کا دماغ اس قدر خراب کر دیا ہو کہ وہ اپنی رعایا پر سخت مظالم کرنے لگا جن کا راج ترنگنی کے مؤلف نے تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ ان مظالم کا سبب دولت کی طمع تھی اور کلہن لکھتا ہے کہ جب وہ بادشاہوں کو روپے کی اور مچھلی کو گدلے پانی کی پیاس ہو جائے تو پھر وہ اپنے مرتبے اور مقام کا بھی کچھ خیال نہیں کرتے اور جب تک موت کے مضبوط جال میں نہ پھنس جائیں، ان کی تشنگی کسی طرح نہیں کم ہوتی!"

للتادت پر ہی منحصر نہیں، کشمیر کے راجہ بالعموم نہایت طامع بے درد اور سخت ظالم ہوئے ہیں۔ راجہ پارتھ اپنی مفلوک الحال رعایا کو تازیانوں سے پٹواتا تھا۔ اس کا بیٹا جو "کہیں زیادہ بدذات" ہوا ہے، لوگوں کو بچھوؤں سے کٹواتا تھا۔ دسویں صدی کے آخری نصف میں دِڈّا نامی رانی کا دور دَورہ ہو گیا تھا۔ اُس نے مُلک کے نظم و نسق میں اور بھی ابتری پھیلا دی؛ دِڈّا کے بھتیجے راجہ سنگ رام کے زمانے میں (سنہ ۹۰۳ تا سنہ ۱۰۲۸ء) سلطان محمود غزنوی نے کشمیر پر حملہ کیا اور اُسے شکست دی۔ لیکن اس شکست کے باوجود کشمیر کی آزادی

میں کوئی فرق نہیں آیا اور یہاں کے راجہ آخر تک اپنی رعایا پر ظلم و ستم ڈھاتے رہے۔ بقول ونسنٹ اسمتھ "دنیا میں بہت کم ملک کشمیر کے اُن راجہ رانیوں کی طویل فہرست کی برابری کر سکتے ہیں، جن کا طرۂ امتیاز شرمناک طمع، وحشیانہ سفّاکی اور بے دردانہ بدنظمی کے سوا کچھ نہ تھا" [۱] (ارلی ہسٹری صفحہ ۳۷۵)

نیپال

قدیم زمانے میں "نیپال" کا لفظ بہت چھوٹے علاقے کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ لیکن یہ ریاست جو ہمالیہ کے دامن میں دوآب کے شمال سے بنگالے کے شمال تک قریب قریب پانچ سو میل طویل ہے، بہت قدیم سے خود مختار رہی اور دشوار گزار کوہستانی زمین ہونے کے علاوہ یہاں کے باشندوں کی قومی خصوصیات بھی ہندوستانیوں سے بالکل جداگانہ ہیں ؏ عہد اشوک میں غالباً نیپال کا جنوبی حصہ سلطنت مگدھ میں داخل تھا لیکن اس کے بعد پھر سمدرگپت کے زمانے تک یہاں کے تاریخی حالات کا پتہ نہیں چلتا ؏ کشمیر کی طرح نیپال کے وقائع بھی قلم بند کئے گئے تھے اور اس مجموعے کا نام "وَم کاولی" ہے مگر اس کی تحریر چنداں اعتبار کے لائق نہیں ؏ البتہ

---

[۱] تیرھویں صدی کے اخیر میں کشمیری مسلمانوں کا ایک خاندان بر سرحکومت ہوگیا تھا اور مغلوں کی فتح، یعنے قریب قریب تین سو برس تک، ملک کشمیر پر یہی اسلامی بادشاہ فرماں روائی کرتے رہے ؏ ۱۲

سمدر گپت کے وقت میں دوبارہ اس ریاست کا ہندوستان کے ماتحت ہونا پایا جاتا ہے۔ بایں ہمہ یہ اطاعت و خراج گزاری شاید اسی طرح برائے نام ہوگی جس طرح آج کل ہے۔ یعنے گو نیپال کے راجہ سالانہ تحائف کی صورت میں سلطنت چین کو خراج ادا کرتے ہیں، دوسری طرف انگریز سفیر بھی ان کے پائے تخت میں مقرّر ہے اور بیرونی معاملات میں وہ اس کی رائے کے پابند ہیں، لیکن ان کی اندرونی خود مختاری میں کوئی فرق نہیں آیا ہے اور انگریزوں کو پایۂ تخت کھٹمنڈو کے سوا اندرون ملک میں جانے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ ہوئین چوئنگ آیا تو لچھوی خاندان کے راجہ نیپال پر حکومت کرتے تھے اور ان کی علمی قابلیت کی اس نے تعریف کی ہے۔

چودھویں صدی کے آغاز سے "وم کاولی" میں کسی قدر مفصّل اور قابلِ اعتبار واقعات ملتے ہیں اور یہ وہ زمانہ ہے جب کہ اجدتھیا خاندان کا ایک راجہ سمراؤں سے بھاگ کر نیپال آیا اور بغیر دقت یہاں کا حاکم بن گیا (۱۳۲۴ء) اس کے تین جانشینوں کے بعد یہ ریاست ایک راجپوت خاندان میں منتقل ہوگئی جس میں یکے بعد دیگرے آٹھ راجہ گزرے ہیں۔ پندرھویں صدی میں آٹھویں راجہ کی اولاد نے ریاست کو چار حصّوں میں تقسیم کرلیا تھا مگر ایک حصّے کا حاکم لاولد مرگیا اور خاندان کی باقی تین شاخوں میں اٹھارویں صدی (یعنی گورکھوں کی فتح کے زمانے تک) حکومت رہی۔ ۱۷۶۸ء میں گورکھوں نے اس

ریاست کا تمام علاقہ فتح کر لیا اور اب تک اسی نو[1] وارد قوم کے راجہ یہاں فرماں روائی کرتے ہیں۔

کامروپ

کامروپ کی قدیم ریاست میں قریب قریب وہ تمام علاقہ داخل تھا جو آج کل اسام، ریاست کوچ بہار اور ضلع رنگ پور میں داخل ہے۔ "مہا بھارت" میں یہاں کے راجہ کا ذکر آیا ہے لیکن اہل تحقیق کے نزدیک اس کے بارے میں سب سے پہلی مستند اور کار آمد معلومات راجہ سمدر گپت کے اُس کتبے میں درج ہے جو اُس نے اشوک کی لاٹھ کے ایک پہلو پر کندہ کرایا تھا (قیاساً ۳۶۰ء) اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں سلطنت گپت کے ہمسائے میں کامروپ کی ریاست خود مختار تھی گو رسمی طور پر وہاں کا راجہ سمدر گپت کا باج گزار مانا جاتا تھا۔ اس کتبے کے کئی صدی بعد دوبارہ کامروپ کا ذکر ہوئین چوئنگ کے سفرنامے میں آتا ہے۔ یہ چینی سیّاح جن دنوں نالندا کی خانقاہ میں مقیم تھا تو اس کے علم و فضل کی شہرت سن کر کامروپ کے راجہ نے بہ اصرار اسے اپنے ہاں بلوایا۔ اگرچہ وہ یا اس کی رعایا میں کوئی شخص بودھ مت کا پیرو

---

[1] گورکھوں کا دعویٰ ہے کہ وہ نسلاً راجپوت ہیں اور مسلمان فاتحین کے سامنے سے مجبوراً ہٹ کر کماؤں کی پہاڑیوں میں آ بسے تھے۔ یہاں سے وہ رفتہ رفتہ شمال میں پھیلے اور آخر اپنے راجہ پرتھوی نرائن کے ماتحت بڑھ کر نیپال خاص پر قابض ہو گئے۔

نہ تھا۔ ہیوئین چوئنگ راجہ کی خاطر سے وہاں گیا لیکن چند ہی روز بعد راجہ ہرش نے سخت تقاضے کر کے اُسے اپنے پاس بلوا لیا۔ بہر حال اس چند روزہ قیام کی بدولت (۶۴۳ء) کامروپ کے کچھ حالات تاریخ میں محفوظ رہ گئے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ اُن دنوں بھی یہ ریاست فرماں روائے قنوج کی باج گزار یا حلیف، کی حیثیت رکھتی تھی۔ راجہ کا نام بھاسکرورمن تھا مگر زیادہ تر کمار کے لقب سے مشہور ہے اور اسی سے قیاس ہوتا ہے کہ ذات کا چھتری یا راجپوت ہوگا۔

بارھویں صدی میں کامروپ یا آسام پر پال خاندان کے راجہ قابض ہو گئے تھے لیکن تیرھویں صدی کے آغاز ہی میں شمالی برما اور سرحد چین کی قوم آہوم اس ملک میں گھس آئی اور اسے اپنی مستقل ریاست بنا لیا۔ یہ قوم زبان و معاشرت اور مذہب و نسل کے اعتبار سے "شانی" تھی لیکن رفتہ رفتہ اُس نے ہندوؤں کے رسم و رواج اور مذہبی عقائد اختیار کر لئے اور ۱۶۵۵ء میں ان کا راجہ چچھنگ فا باضابطہ ہندومت کے دائرے میں داخل ہوگیا۔ مسلمانوں نے اس ملک پر وقتاً فوقتاً جو حملے کئے اُن کا ذکر اپنی جگہ پر آئے گا لیکن یہ بالعموم تادیبی مہمیں تھیں اور ان کے بھیجنے کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ اہلِ اسام کو ان کی قزّاقانہ یورشوں کی سزا دی جائے۔ بڑی آب وہوا کثرت باراں، دشوار گزار پہاڑی مقامات ہونے کی وجہ سے مسلمان اس دور دست حصۂ ملک پر مستقل طور پر قبضہ نہ رکھ سکے نہ

اس کا انہوں نے کبھی پختہ ارادہ کیا ؛

دوسری فصل شمالی ہندوستان کی ریاستیں

قنوج کتاب کے شروع میں ہی ہم پنچال یا پنکال قوم کا حال پڑھ چکے ہیں کہ دورِ قدیم میں یہ لوگ دریائے گنگا کے شمال و جنوب دونوں جانب پھیلے ہوئے تھے ؛ غالباً اسی زمانے میں ان کا ملک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا اور گنگا ان کی حدِ فاصل تھی۔ شمالی ٹکڑے کا پائے تخت رہچھتر میں تھا جو اب رام نگر کے نام سے بریلی کے ضلع میں واقع ہے۔ جنوبی حصے کا صدر مقام کامپیلی تھا اور فرخ آباد کے ضلع میں قصبہ کمپل کو اسی قدیم راج دھانی کی یادگار بتاتے ہیں ؛ ان میں سے پہلا شہر ہوئین چونگ کی سیاحت کے زمانے تک خاصا آباد تھا لیکن کامپیلی کی جگہ قنوج نے چھین لی تھی جو اس کے قریب ہی دریائے گنگا کے کنارے آباد ہوا اور فاہیان کے وقت میں چھوٹا سا شہر بن گیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے گپت خاندان کے زمانے میں اس شہر نے بہت ترقی کی اور ہرش کو اپنی وسیع سلطنت کے لئے اس سے بہتر صدر مقام نہ ملا۔ لہٰذا ساتویں صدی گویا اس شہر کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا اور اس کی سب سے معتبر شہادت ہوئین چونگ کا سفرنامہ ہے۔ کیونکہ جب یہ چینی سیاح یہاں آیا تو اس شہر میں صرف بودھ مت والوں کی سو سے زیادہ خانقاہیں تھیں جن میں

دس ہزار سے زیادہ درویش رہتے تھے - اور ہندومت کے مندروں کا شمار ان خانقاہوں سے بھی دُگنا تھا ؟

لیکن ہرش کے لاولد فوت ہوتے ہی جب سلطنت میں بدنظمی پھیلی تو قنوج پر اس کے وزیر ارجن نے غاصبانہ قبضہ کرلیا اور اسی کے حکم سے چینی سفیر پر جو ہرش کے دربار کا معزز مہمان تھا ہندی سپاہیوں نے حملہ کیا - اس حملہ کی کوئی خاص وجہ ہمیں معلوم نہیں لیکن اسی بدسلوکی کا بدلہ لینے کی غرض سے تبت کے راجہ نے جسے چینی شہزادی بیاہی تھی، قنوج پر فوج بھیجی اور سفیر مذکور نے ارجن کو کئی شکستیں دے کر قید کیا اور اپنے ساتھ واپس لے گیا ؟ یہ ۶۴۸ء یا ۶۴۹ء کا واقعہ ہے اور اس کے بعد راجہ جس ورمن (Yasovarman) کے عہد تک قنوج کا کہیں نام نہیں آتا ؟

راج ترنگنی کی روایات کے مطابق جس ورمن کو کشمیر کے راجہ للتادت نے شکست دے کر معزول کر دیا تھا - جس کا ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں - لیکن اس راجہ کا عہد اور کسی لحاظ سے قابل ذکر ہو یا نہ ہو اس اعتبار سے ضرور یادگار ہے کہ بھوبھوتی (Bhavabhuti) جیسا نامی شاعر اسی زمانے میں ہوا اور اس کی زندگی کا بڑا حصہ دربار قنوج ہی میں گزرا - بھوبھوتی نے تین ناٹک لکھے ہیں اور پہلے دو (یعنی "مہابیر چرت" اور "اتر رام چرت") میں گویا رامائن کی مثنوی کو ڈراما کا لباس پہنا دیا ہے - ان دونوں کے سات سات پاٹ (یا ایکٹ) ہیں -

...و بھوتی اور ...اک ہتی -

مگر تیسرے یعنی "مالتی مادھو" کے دس پاٹ رکھے ہیں اور اس میں روز مرہ کی خانگی زندگی کو دکھایا ہے۔ مالتی اور مادھو جن کا یہ قصہ ہے دو ہمسایہ بادشاہوں کے وزیروں کی اولاد میں تھے اور ان کی بچپن ہی میں نسبت قرار پاگئی تھی۔ لیکن مالتی کے باپ کو اس کا آقا مجبور کرتا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کا رشتہ اس کے ایک منظور نظر مصاحب سے کر دے جو بہت بد صورت اور بوڑھا تھا۔ چنانچہ راجہ کے اصرار نے مالتی اور مادھو کو عرصے تک فراقِ دائمی کی فکر میں مبتلا رکھا۔" اس قصے کے بیان کرنے میں شاعر نے سچے جذبات کی بہت پُر اثر تصویر کھینچی ہے اور جا بہ جا نہایت جوش انگیز (اگرچہ کسی قدر محال) واقعات دکھائے ہیں تو ہندوستان کے نقادانِ فن کے نزدیک یہ شاعر نہ صرف کالیداس کا ہم پلہ ہے بلکہ "اتررام چرت" میں اس پر بھی سبقت لے گیا ہے ××× تغزّل میں گو اس کا مرتبہ واقعی بلند ہے تاہم ناٹک نویس شاعر کی حیثیت سے وہ کالیداس کی برابری نہیں کر سکتا۔ ان دونوں کی شاعری میں نہایت نمایاں فرق یہ ہے کہ کالیداس قلبِ انسانی کے نازک حسیات اور خموش و پُرامن دہقانی زندگی کی مصوری کا دل دادہ ہے اور بھوبھوتی انسانی طبیعت اور فطرت کے زیادہ پُر ہیبت پہلو دکھانے پر مائل ہے۔ دوسرے شُستہ اور پر لطف ہونے کے باوجود اُس کا کلام کالیداس کے مقابلے میں، زیادہ تصنع آمیز اور طویل معلوم ہوتا ہے اور اس میں اُن قیود و قواعد کی بے حد پابندی کی گئی ہے جو ناٹک

نویسی کے نظری ماہروں نے گھڑ لئے تھے۔" (انسائی کلو-جلد ۲۴ ص ۱۷۳)

ایسے باکمال ہم عصر کے مقابلے میں واک پتی کو اگر کوئی امتیاز حاصل ہے تو اس بات میں کہ وہ پراکرت کا شاعر ہے اور اس زبان میں صرف دو ہی شاعروں نے رزمیہ مثنویاں لکھی ہیں جن میں واک پتی کی "گودوہا" تاریخی حیثیت رکھتی ہے کہ اس میں جس دھرمن کی بنگالے پر فوج کشی اور فتوحات کا بیان ہے۔

بعد کے راجہ

جس دھرمن کے بعد آٹھویں صدی کے خاتمے تک اُس کے دو جانشین یکے بعد دیگرے قنوج میں تخت نشین ہوے لیکن پہلے کو کشمیر کے راجہ نے دوبارہ شکست دے کر معزول کر دیا اور دوسرے سے بنگالے کے راجہ دھرم پال نے حکومت چھین کر ایک اور شخص چکراجدھ کے سپرد کر دی۔ یہ غالباً قنوج کے شاہی خاندان سے تھا اور اس کی بادشاہی کو سب ہمسایہ راجاؤں نے باضابطہ تسلیم کر لیا تھا۔ لیکن اس کی تقدیر میں بھی وہی تلخ کامی لکھی تھی کہ ۸۱۶ء میں راجپوتانے کے ایک راجہ ناگ بھٹ نے اس پر حملہ کیا اور سلطنت چھین لی۔

گرجروں کی حکومت

ناگ بھٹ دراصل گرجروں (یا گورجروں) کی قوم کا راجہ تھا اور یہ قوم جس کے بہت سے لوگ آج بھی ہندوستان میں موجود ہیں، غالباً باہر سے یہاں آئی اور ہونوں کی ہم نسل نہیں تھی تو کم سے کم عرصے تک ان کے ساتھ ضرور رہی۔ اس کا ایک گروہ "پریہار" یا "پرتیہار" (Pratbibara) کہلاتا تھا اور

شاید چھٹی صدی عیسوی میں انہوں نے مل کر راجپوتانے کے وسطی علاقے میں ایک خود مختار سلطنت قائم کی تھی جس کا پایۂ تخت بھیل مال (یا بھین مال) کوہ آبو سے کوئی پچاس میل شمال مغرب میں واقع تھا۔ اسی سلطنت کی ایک شاخ بڑوچ میں تھی اور بعد میں "پریہار" نامی گروہ نے بندھیل کھنڈ میں اپنی ریاست الگ بنائی جس کا صدر مقام موسہنی موجودہ چھترپور کے قریب تھا۔

بہر حال، فتحمند راجہ کو قنوج لینے کے بعد شاید اپنے پرانے پائۂ تخت میں رہنا پسند نہ آیا اور اس نے گنگا کے کنارے کو راجپوتانے کے ریگستان پر ترجیح دی۔ چنانچہ سلطان محمود غزنوی کے حملوں کے وقت تک اسی ناگ بھٹ کی اولاد قنوج میں حکومت کرتی تھی۔ مگر ناگ بھٹ اور اس کے بیٹے رام دیو (یا رام بھدر) کے متعلق سوائے اس کے کچھ معلوم نہیں کہ وہ غالباً ۸۲۵ء سے ۸۴۰ء تک راج کرتے رہے۔ البتہ ان کے جانشین راجہ مہیر کو جو بھوج کے لقب سے مشہور ہے، بہت عروج حاصل ہوا اور اس نے قریب قریب پچاس برس تک اقبال و کامرانی کے ساتھ بادشاہی کی۔ اس کی حدودِ سلطنت معلوم کرنے کا کوئی معتبر ذریعہ نہیں ہے لیکن قرائن کہتے ہیں کہ اودھ سے جنوب مشرقی پنجاب تک اور مغرب میں راجپوتانہ و گجرات اس کی قلمرو میں داخل تھے۔ گویا شمال مغربی سرحد پر دریائے ستلج تھا تو جنوب مغربی سرحد نربدا تک وسیع تھی اگرچہ مالوے کے

مشرقی علاقہ اور بندھیل کھنڈ میں علیحدہ آزاد ریاستیں موجود تھیں جن کا حال آگے آتا ہے مشرق کی طرف بنگال و بہار کے راجاؤں سے بھوج کی سرحد جا ملتی تھی۔ اور شاید کچھ عرصے کے لئے مگدھ کی ریاست بھی قنوج کی باج گزار ہو گئی تھی۔ اس طرح بھوج اپنے زمانے میں ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست کا مالک تھا۔ اور اگر وہ سب سے بڑی نہ تھی تو کم سے کم سب سے زیادہ دولت مند اور طاقتور ضرور تھی۔ چنانچہ راجہ بھوج کی دولت اب تک شمالی ہندوستان میں ضرب المثل ہے اور اس کی جنگی قوت کے متعلق ایک عرب سیاح کا بیان ہے کہ رسالے اور شتر سواروں کی جیسی عمدہ اور جنگجو فوج بھوج کے پاس ہے، ایسی ہندوستان کے کسی راجہ مہاراجہ کے پاس نہیں۔

سکّوں سے یہ بات ثابت ہے کہ بھوج وشنو دیوتا کا پرستار تھا، چنانچہ ان سب پر اسی دیوتا کے اوتار" ادی و راہہ " کا نام کندہ ہے۔ صورت میں یہ سکّے ساسانی روپے کی طرز پر ڈھالے جاتے تھے اور ان کا نام " درام" ہوتا تھا جو یونانی دراکمہ" (ایرانی دارِک) کی یادگار ہے اور بعد میں " دام" رہ گیا تھا۔ ہماری زبان میں " دمڑی" اور " چھدام" اسی لفظ کی ذرّیات ہیں۔

پچاس برس کے قریب فرماں روائی کرنے کے بعد بھوج نے وفات پائی (سنہ ۸۹۰ء) تو اس کا بیٹا مہندر پال وارث

تخت و تاج ہوا۔ اس کی تخت نشینی اور وفات (۹۰۸ء؟) کے سن صحت کے ساتھ معلوم نہیں اور نہ کوئی تاریخی واقعہ محفوظ ہے۔ البتہ اُسے اتنا فخر ضرور حاصل ہے کہ پراکرت زبان کے دکنی شاعر راج سکھ کا شاگرد تھا جس نے چند ناٹک اور فن شعر پر ایک کتاب تصنیف کی تھی جو حال میں طبع کر دی گئی ہے۔

مہندر پال کے بعد پرہہار یا گوجروں کے خاندان شاہی میں کوئی ایسا راجہ نہیں ہوا جو اپنی آبائی ریاست کو کم سے کم اغیار کے حملوں سے بچا لیتا۔ ۹۱۶ء میں راشٹر کوٹ خاندان کے دکنی راجہ اندر (ثالث) نے شمالی ہند پر حملہ کیا اور مہندر کے پوتے مہی پال کو شکست دی۔ فاتح کا خاص پائے تخت قنوج پر قبضہ ہو گیا تھا۔ لیکن گو وہ زیادہ عرصے یہاں نہ ٹھیرا اور اس کے واپس جاتے ہی مفرور مہی پال دوبارہ قنوج میں آگیا، تاہم اس شکست نے ریاست کی مرکزی قوت کمزور کر دی اور غالباً اسی وقت سے گجرات وغیرہ کے صوبے راجگان قنوج کے ہاتھ سے نکلنے لگے، اور آخر میں بندھیل کھنڈ کے (چندلوں یا) چندیلوں نے انہیں حملے کر کے اور بھی کمزور کر دیا۔ بایں ہمہ پنجاب کے راجہ جے پال نے جب غزنی کی نوخیز سلطنت سے لڑائی مول لی تو اس کے حلیفوں میں قنوج کے راجہ بجے پال (Vijayapala) کی فوج بھی شریک تھی (۹۹۱ء) اس کے اٹھائیس انتیس برس بعد سلطان محمود غزنوی نے خاص قنوج پر حملہ

کیا تو اس وقت ججے پال کا بیٹا بھوج کا جانشین اور یہاں کا راجہ تھا۔ مسلمان موّرخوں نے اس کا نام رائے جے پال لکھا ہے لیکن حال میں بعض کتبات سے معلوم ہوا کہ وہ دراصل "راجے پال" تھا۔ سلطان محمود کی اس راجہ نے اطاعت قبول کر لی تھی اور بعد میں اسی الزام پر اپنے ہمسایوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔

گہرواڑوں کی حکومت

ان گورجروں (یاگوجروں) کے خاندان کا خاتمہ گہرواڑوں کے ہاتھ سے ہوا۔ تفصیلی حالات و اسباب کا ہمیں علم نہیں لیکن ۱۰۹۰ء میں ہم اس نئے خاندان کے راجہ چندر دیو کو قنوج کا فرماں روا پاتے ہیں۔ یہ خاندان جس کا اصلی نام "گہدوال" ہے غالباً چندیلوں کی برادری میں داخل تھا مگر قنوج کی ریاست ملنے کے بعد اسے بہت عروج حاصل ہوا۔ خاص کر بانیٔ خاندان کے تیسرے جانشین گوبند چندر نے بڑی قوّت پائی اور تقریباً پچاس برس تک حکومت کرتا رہا (قیاساً ۱۱۱۰ء تا ۱۱۶۰ء) اسی راجہ کا پوتا جے چند یا جے چندر ہوا ہے جس کی پرتھی راج سے عداوت کے قصّے مشہور ہیں۔ پرتھی راج کی شکست اور مسلمانوں کے دلّی پر قابض ہونے کے بعد جے چند نے بڑے پیمانے پر جنگ کی تیاری کی تھی اور اسے دعویٰ تھا کہ مسلمانوں کو اپنی حدودِ مملکت میں قدم نہ رکھنے دیگا لیکن جب دریائے جمنا کے کنارے چندر اوڑ (ضلع اٹاوہ) کے میدان میں مقابلے کی نوبت آئی تو جے چند کے لشکر عظیم کو سخت شکست ہوی وہ

خود مارا گیا اور اس کی ریاست مسلمانوں کے قبضے میں آ گئی۔ (۱۱۹۴ء) گھرواڑ خاندان کے بہت سے راجپوت سردار قنوج سے نکل کے راجپوتانے کے بیابانوں میں پناہ گزین ہوئے اور یہاں انہوں نے جودھپور کی ریاست قائم کی جو اب تک موجود ہے۔ مگر جودھپور پہنچ کر اُن کے خاندان کا اصلی نام بدل گیا اور وہ "راٹھور" کہلانے لگے[1]۔

بندھیل کھنڈ جمنا اور نربدا ندی کے درمیان کا وہ علاقہ جو اب بندھیل کھنڈ کہلاتا ہے پہلے ججھوتی (یا "ججاک بھوکتی") کے نام سے موسوم تھا اور نویں صدی عیسوی میں غالباً یہاں گوجر (یا پریہار) قوم کے سردار حکومت کرتے تھے۔ ۸۳۱ء میں نانک چندیل نے انہی کے کسی رئیس کو شکست دے کر چھترپور کے قریب ایک چھوٹی سی ریاست قائم کی اور بندھیل کھنڈ کے چندیل راجہ اسی شخص کی اولاد میں تھے۔ قومیت کے اعتبار سے یہ راجہ گونڈ سمجھے جاتے ہیں۔ مگر انہوں نے برہمنوں کا مذہب اور وہی تمدن اختیار کر لیا تھا اور قرینہ کہتا ہے کہ اوّل اوّل وہ راجگانِ قنوج کے باج گزار ہوں گے۔ لیکن دسویں صدی کے آغاز میں جب اُن کا قلعۂ کالنجر پر قبضہ ہوا (۹۱۶ء) تو پھر اُن کی قوّت بڑھ گئی اور خود قنوج پر دست تصرّف دراز کرنے لگے۔ اب ان کی حدود ریاست جمنا کے کنارے تک وسیع ہو گئی تھیں اور اس میں تین بڑے بڑے شہر تھے: مہوبا، کھجورا ہو، اور کالنجر جہاں

---

[1] اوکس ص۔ ۱۸۶

اس خاندان کے راجاؤں نے بہت سی عمارتیں اور تالاب بنوائے تھے؛ خاص کر کھجوراہو کے عظیم الشان مندر، بنانے والے کی دولت اور شوقِ تعمیر کی سب سے اچھی یادگار ہیں اور ان کی تعمیر دھنگ راجہ سے منسوب کی جاتی ہے جو چندیل خاندان کا سب سے اقبال مند فرماں روا تھا۔ پنجاب کے راجہ جے پال نے جب امیر سبکتگین کے سفیروں کو لاہور میں قید کیا اور امیر موصوف نے فوج کشی کی تو جے پال کی مدد کے واسطے جو راجہ مہاراجہ فوجیں لے لے کے پنجاب گئے تھے، انہی میں دھنگ بھی شامل تھا۔ بعد میں بھی اس کے جانشین سلطان محمود غزنوی کی مخالفت میں حصہ لیتے رہے جس کا ذکر مسلمانوں کی تاریخ میں آئے گا؛ مگر بندھیل کھنڈ کے چندیل ہوں یا مالوے کے پرمار (یا پوار) اور یا وسط ہند (چیدی) کے کلچوری، یہ سب ہندوستان کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے رئیس تھے اور اوّل تو ان کی مفصّل و معتبر تاریخ موجود نہیں دوسرے جو کچھ واقعات محفوظ ہیں، اُن کا ضروری خلاصہ ہم اپنی پہلی تاریخ (برائے میٹ ری کیولیشن) میں لکھ چکے ہیں۔ انہیں دہرانے کی بجائے بہتر ہوگا کہ اس جگہ راجپوتی انساب کے متعلق اجمالی بحث کی جائے اور آخر میں بنگالے کے دو حکمران خاندانوں کا ذکر کر دیا جائے جنھوں نے فی الجملہ شاہانہ اقتدار حاصل کر لیا تھا؛

تیسری فصل۔ راجپوتوں کا نسب ؛ بنگالے کے راجہ

"راجپوت" کے لفظی معنی ہیں راجہ کا بیٹا یا امیر زادہ۔ لیکن جس طرح "امیرزادہ" کا مخفف "میرزا" آج کل ہندوستان میں قومیت کی علامت بن گیا ہے، اسی طرح "راجپوت" بھی ایک خاص قوم کے معنی میں مستعمل ہوا اور پھر یہ لوگ دعویٰ کرنے لگے کہ ہم سب کشتری یا چھتریوں کی ایک ہی نسل سے ہیں۔ حالانکہ اس بات کی بہت سی شہادتیں موجود ہیں کہ جو لوگ اس زمانے میں اپنے تئیں راجپوت کہتے ہیں[1] وہ بالکل

---

[1] کثرت تعداد کے اعتبار سے آج کل راجپوتوں کے آٹھ بڑے بڑے قبیلے یا گوت ہیں:

(۱) راٹھور۔ ان کی تعداد سوا لاکھ کے قریب ہے۔ مارواڑ (جودھپور) بیکانیر اور کشن گڑھ کے راجہ اسی قبیلے سے ہیں۔

(۲) کچھواہہ۔ جے پور و الور میں برسر اقتدار ہیں۔ ۱۹۱۰ء میں ان کی تعداد ایک لاکھ سے کچھ زیادہ تھی؛

(۳) چوہان۔ اس قبیلے کے افراد ریاست ہائے بوندی، کوٹہ اور سروہی کے رئیس ہیں۔ کل تعداد نوّے ہزار سے بھی کم ہے؛

(۴) سسودھیا۔ اس قبیلے کی تعداد پچاس پچپن ہزار سے زیادہ نہیں۔ مگر اودے پور میواڑ کے نامی راجہ مہاراجہ اسی قبیلے سے ہیں؛

(۵) جادو۔ (۶) پنوار (۷) سولنکی اور (۸) پریہار بھی مشہور قبائل ہیں مگر ان کی تعداد کم ہے اور کوئی بڑی ریاست ان کے زیر حکومت نہیں؛ ان کے علاوہ

بقیہ صفحہ آئندہ

مختلف قوموں کی اولاد ہیں جن میں سے بعض قدیم سے ہندوستان میں آباد تھیں، بعض نسلاً آریا ہیں اور بعض بہت بعد میں ہندوستان آئیں ۔

واضح رہے کہ خود "کشتری" کا لفظ کسی خاص قوم کے لئے مخصوص نہیں تھا اور گو اس قدر قدیم ہے کہ اب اس کی اصلیت نگاہ سے مخفی ہو گئی تاہم ونسنٹ اسمتھ کے نزدیک سوائے برہمنوں کے ہر ذات کا آدمی جو تختِ حکومت حاصل کر لیتا تھا، اِس نام سے موسوم ہو جاتا تھا[1] پھر جب بہت سے خاندان جنھیں قسمت نے دولت و حکومت سے محروم کر دیا، بزرگوں کی یادگار میں اسی نام سے کشتری یا چھتری کہلاتے رہے تو قیاس چاہتا ہے کہ نئے حکمرانوں نے اپنے لئے ایک اور لقب (راجپوت) اختیار کر لیا تاکہ عام چھتریوں میں اور اُن میں امتیاز رہے ۔ لیکن دولت و حکومت آنی جانی چیز ہے۔ دورِ وسطیٰ کے انقلابات نے ہندوستان کے بیسیوں خاندانوں کو تختِ شاہی سے محروم کر دیا اور جب مسلمان یہاں آئے تو وہ ہندو حکمران جو اب "راجپوت" کہلاتے تھے، یا تو اُن کے باج گزار بن گئے اور یا شکستیں کھا کر اُنھوں نے مغربی

راجپوتوں کے اور بہت سے قدیم قبائل راجپوتانے میں اور اس کے باہر آباد ہیں اور ایک معقول تعداد نے دین اسلام اختیار کر لیا ہے ۔ ۱۲

[1] ارلی ہس - ۴۰۸

ریگستان کی راہ لی جہاں دشمنوں کی رسائی دشوار تھی۔ انہی پناہ گزینوں کی بہ دولت یہ صحرائی ملک راجستان یا راجپوتانہ کے نام سے مفتخر ہوا۔

ستیھی عناصر

بہر کیف اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ راجپوتوں کے تمام قبائل کسی ایک نسل سے نہیں ہیں بلکہ اُن میں مختلف قوموں کے خون کی آمیزش ہے۔ اس قدر تو کپتان ٹاڈ نے بھی تحریر کیا ہے کہ راجپوت قبائل کی بعض عادات اور اوہام اُن کے سیتھی یا سیدی ہونے کا پتہ دیتے ہیں[1]۔ اور ٹاڈ وہ شخص ہے جس نے تقریباً سو برس پہلے (۱۸۲۹ء میں) اپنی مشہور کتاب "اینلز اینڈ این ٹی کوی ٹیز اوف راجستان" مرتب کی تھی۔ اور بھاٹوں کے گیت اور افسانے تک اپنے "وقائع" میں داخل کر لئے تھے؛ تحقیقاتِ جدید سے اس قیاس کی تصدیق ہوتی ہے اور گو کوئی تحریری سند میسر نہ آئے تاہم سیتھیوں کے بعد جو قومیں ہندوستان میں آئیں اُن کے حالات کا مطالعہ کرنے سے اس قول کے باور کرنے میں کوئی شک نہیں رہتا کہ پہلے آنے والوں نے بھی اسی طرح ہندوستان کی قدیم آبادی میں اپنے واسطے جگہ نکال لی ہوگی جس طرح کہ پانچویں صدی عیسوی کے بیرونی حملہ آوروں نے رفتہ رفتہ حاصل کر لی ہے کہ اب ان میں اور دوسرے راجپوت قبائل میں کوئی امتیاز نہیں رہا۔ بلکہ ان نووارد گروہوں کو بھی اسی

[1] دیکھو اس کی کتاب جلد اوّل صفحہ ۳۱

قدیم نسل میں مان لیا گیا جس کی تین شاخیں چندر بنسی سورج بنسی، اور اگنی کُل کے نام سے موسوم ہیں"۔

ان پانچویں صدی کے آنے والوں سے ہماری مراد "ہون" قوم کے لوگ ہیں۔ مغربی ہند پر اُن کی یورش کا حال پہلے ہماری نظر سے گزر چکا ہے اور یہ بھی ثابت ہے کہ گورجر یا گوجر قوم کے لوگ ان کے ہم نسل تھے یا کم سے کم ان کے ہمراہ باہر سے ہندوستان میں آئے اور چھٹی ساتویں صدی عیسوی میں راجپوتانے اور پنجاب میں اُن کی متعدد ریاستیں قائم ہوئیں۔ ان میں سب سے مشہور ریاست بھیل مال یا بھین مال تھی اور یہیں کا راجہ ناگ بھٹ آخر میں قنوج پر قابض ہو گیا تھا (صفحہ ۲۰۶) "اس امر کا اب قطعی ثبوت مل گیا ہے کہ راجہ بھوج اور اس کے اسلاف و اخلاف گوجروں کی ایک شاخ میں تھے جو پرتی ہار یا پریہار کہلاتی ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ راجپوتوں کا مشہور قبیلہ "پریہار" گوجروں ہی کی نسل سے ہے"[1] حالانکہ خود "گوجروں" کو کوئی ہندو کشتری یا راجپوت نہیں مانتا۔[2]

---

[1] ارلی ہسٹری صفحہ ۴۱۱۔

[2] اس جگہ یہ لکھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ پنجاب کے بہت سے جاٹ اپنے تئیں "راجپوت" یا چھتری بتاتے ہیں (رپورٹ مردم شماری ۱۹۱۱ء) اور جدید اہل تحقیق کے نزدیک یہ جاٹ اور گوجر ایک ہی نسل سے ہیں۔ مگر برہمن لوگ جاٹوں کے اس دعوے کو نہیں مانتے اور اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ تین چار صدی پہلے اس قوم کے لوگوں میں حکومت نہ تھی۔ "راج" حاصل ہونے کے بعد اُس کے بعض خاندانوں نے "راجپوت" ہونے کا دعویٰ کیا ہوگا اور چونکہ یہ حال کا واقعہ ہے غالباً اس لیے

بقیہ بر صفحہ آئندہ

چندیل اور راٹھور

جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ "پریہار" حقیقت میں گوجر ہیں اور اپنی اصلی قوم سے الگ کر کے انہیں راجپوتوں میں شامل کر لیا گیا ہے، تو پھر قدرتی طور پر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ راجپوتوں کے وہ قبیلے جو پریہاروں کے ہم نسل سمجھے جاتے ہیں، اسی طرح غیر آریا ہوں گے۔ لیکن چونکہ اُن کے گوجر ہونے کی کوئی بلا واسطہ شہادت موجود نہیں لہذا اس بحث کو یہاں چھیڑنا بے محل ہوگا۔

البتہ اس امر کی عمدہ شہادتیں موجود ہیں کہ چندیل (راجپوتوں) کا ہندوستان کے قدیم گونڈوں سے قریبی تعلق تھا اور "اسی بنا پر یہ نتیجہ نکالنا بالکل حق بجانب ہوگا کہ چندیل راجپوت درحقیقت بہار یا گونڈ قوم کے لوگ ہیں جو ہندو مذہب اور تمدن کے رنگ میں رنگ گئے اور حکومت و بادشاہی حاصل کرنے کے بعد کشتری یا راجپوت سمجھے جانے لگے ...." (ارلی ہس۔صفحہ ۴۱۳)

اسی طرح راٹھور قوم کے راجپوت جو کہ "گہرواڑوں" کی شاخ ہیں، چندیلوں کے ہم نسل تھے جو دوآب سے نقل مکان کر کے راجپوتانے میں آ بسے اور اب خالص آریا نژاد راجپوت مانے جاتے ہیں۔

پال خاندان

جس وقت ہندوستان خاص کے علاقوں میں یہ ہل چل مچی ہوی تھی اور بعد میں سلطان محمود غزنوی کے حملوں نے

بقیہ صفحہ گزشتہ

برہمنوں نے انہیں چھتریوں کی ذیل میں داخل نہیں کیا۔

رہے سہے امن و اطمینان میں خلل ڈال رکھا تھا، مشرقی صوبوں کی حالت نسبتاً اچھی تھی۔ آٹھویں صدی عیسوی میں وہاں کی حکومت مستقل طور پر گوپال راجہ کے خاندان میں منتقل ہوگئی اور چونکہ اس کے جانشینوں کے نام کا جزوِ آخر "پال" (Pala) ہے اس لئے یہ سب پال خاندان کے راجہ کہلاتے ہیں۔

قرائن سے پایا جاتا ہے کہ اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ کو ۷۵۰ء میں بادشاہی کے لئے "منتخب" کیا گیا تھا مگر اس کا پتہ چلانا محال ہے کہ آیا یہ انتخاب کسی خاص شہر کے اعیان و اشراف نے کیا تھا یا اس میں تمام صوبے کے سربرآوردہ رئیس و راجہ شریک تھے۔ بہر حال خاص طور پر ذکر کے قابل یہ بات ہے کہ راجہ گوپال بودھ مت کا پیرو تھا اور اس نے اُدنت پور میں اس مذہب کے درویشوں کے واسطے بہت بڑی خانقاہ تعمیر کی تھی۔ (اُدنت پور جو بعد میں اس خاندان کے راجاؤں کا صدر مقام ہوگیا تھا آج کل قصبۂ "بہار" کے نام سے موسوم ہے) اور اس کے معنی یہ ہیں کہ گوتم کا مذہب ہندوستان کے اور کسی حصے میں رہا ہو یا نہ رہا ہو، اصلی وطن میں ابھی تک اس کے نام لیوا موجود تھے۔ اگرچہ اس میں شبہ نہیں کہ اب اس مذہب کی صورت بالکل بدل گئی تھی اور کنشک راجہ کے زمانے میں جو دو گروہ ہو گئے تھے ان کے اصولی عقائد میں بھی اب فرق آگیا تھا۔

گوپال کے بعد دھرمپال بنگالے کا راجہ ہوا اور گو بینن کا پتہ نہیں چلتا تاہم اتنا ثابت ہے کہ اُس نے کم از کم بتیس برس حکومت کی اور ہندوستان خاص کے تمام علاقے غالباً اس کے زیرنگیں ہو گئے تھے؛ موجودہ بھاگلپور کے علاقے میں اُس نے نہایت وسیع خانقاہ بنائی تھی اور بیان کرتے ہیں کہ اس کے اندر سو سے زیادہ معبد اور چھ بڑی بڑی درس گاہیں تھیں۔ مگر زمانے کی دست بُرد نے انہیں ایسا بے نشان کیا کہ اب یقینی طور پر یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ عمارت کس مقام پر تھی*

دھرمپال کا بیٹا دیو پال اس خاندان کا سب سے بڑا فرماں روا مانا جاتا ہے کیونکہ اس کے عہدِ حکومت میں کلنگ اور اسام تک تمام مشرقی ہندوستان فتح ہو کر سلطنت بنگالہ میں داخل ہوا اور ایک حد تک گپت اور موریا خاندان کی یاد تازہ ہو گئی۔ اپنے باپ اور دادا کی طرح دیو پال بودھ مت کا پُرجوش پیرو تھا اور اس مذہب کے سب سے نامور فرماں روا اشوک کی مثل اسے بھی "دھرم کا ڈنکا بجانے" کی آرزو تھی۔ بلکہ مشہور ہے کہ اِسی کی خاطر اُس نے غیر مذہب والوں پر فوج کشی کی اور اُن کی بہت سی بستیاں (یا قلعے) تاراج و برباد کر دیں؛ روایتِ عام کی بہ موجب وہ اڑتالیس برس تک حکمران رہا اور چند بڑے بڑے تالاب اس کی یادگار ہیں؛

دیو پال کے بعد پہاڑی قبیلوں نے جنھیں کام بوج یا

*جناب غلام یزدانی صاحب ایم اے ناظم آثار قدیمہ حیدر آباد تحریر فرماتے ہیں کہ "کچھ

بقیہ صفحہ آئندہ

کہتے ہیں بنگالے پر یورش کی اور بہت دن تک ملک پر ان کا قبضہ رہا۔ آخر ۹۷۵ء یا اس کے قریب راجہ مہی پال نے ان کو دفع کرکے بزرگوں کا ورثہ دوبارہ حاصل کرلیا اور شاید اسی واقعے کی بہ دولت اپنے ہم وطنوں میں آج تک محبوب و محترم سمجھا جاتا ہے۔ اُس کے عہد کا یہ عجیب واقعہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ چولا خاندان کے راجہ راجندر نے ۱۰۲۳ء میں شمالی ہندوستان پر فوج کشی کی اور جنوبی دکن سے گنگا کے کنارے تک بڑھ آیا۔ معلوم ہوتا ہے کام بوجوں کی یورش اور اس دکنی راجہ کے حملے ہی نے پال خاندان کو اتنا کمزور کردیا تھا کہ تھوڑے عرصے بعد بعض جنوبی اور مشرقی صوبے اُن کے ہاتھ سے نکل گئے۔ بایں ہمہ بارھویں صدی میں مسلمانوں کے حملہ آور ہونے کے وقت مغربی بنگال یا بہار پر اسی خاندان کے راجہ حکومت کرتے تھے اور اُن کا خاص امتیاز یہ ہے کہ غالباً سب کے سب بودھ مت کے پیرو تھے۔[۱]

(بقیہ صفحہ گزشتہ) مسلمان یا کھتری وغیرہ انہی کام بوجوں کی اولاد ہیں۔

[۱] ان کی مذہبی خدمات میں سب سے مشہور وہ سفارتیں ہیں جو مہی پال اور اس کے بیٹے نے پال کے زمانے میں تبّت بھیجی گئیں۔ ان میں اس مذہب کے بعض نامور عالم بھی گئے تھے جن کی محنت اور سعی کی بہ دولت بودھ مت تبّت میں پھیلا اور آخر میں اُسے وہ قوّت حاصل ہوی جو رومن کیتھولک مذہب کو یورپ میں حاصل ہوگئی تھی۔ چنانچہ اب تک تبّت کا مذہبی پیشوا جسے "لاما" کہتے ہیں، ایک حد تک وہاں کا ملکی فرماں روا مانا جاتا ہے۔

سینی خاندان

گیارھویں صدی کے اواخر میں کلنگ یا اڑیسے کے راجہ چورگنگ نے بڑی قوت حاصل کی تھی اور غالباً اسی کا ایک فوجی سردار سَمنت دیو اڑیسے کے شمال میں (موجودہ ریاست میور بھنج کے علاقے میں) ایک چھوٹی سی جاگیر کاسی پوری کا مالک بن گیا تھا۔ قیاس چاہتا ہے کہ شاید اس کی اور اُس کے دو جانشینوں کی حیثیت معمولی جاگیرداروں کی سی تھی اور وہ اپنے آقا چورگنگ کے خراج گزار سمجھے جاتے تھے۔ چونکہ پال خاندان کے راجہ والیٔ کلنگ کے حریف تھے لہذا عجب نہیں کہ اسی کلنگ کے راجہ کے اشارے سے کاسی پوری کے یہ جاگیردار بنگالے پر تاخت تاراج کرتے ہوں۔ پھر پال خاندان کی قوت میں ضعف آیا تو سَمنت دیو کے پوتے بلال سین نے مشرقی بنگالے کا بہت سا حصہ دبا لیا اور وہاں خود مختار ریاست قائم کی۔ یہ ۱۱۰۰ء یا اس کے کچھ بعد کا واقعہ ہے اور گو اس خاندان کو کچھ زیادہ عرصے تک حکومت کرنی نصیب نہ ہوی تاہم بلال سین اور اس کے بیٹے لکشمن سین کا زمانہ بنگالے کی تاریخ میں اس لئے یادگار ہے کہ یہ برہمنوں کے حامی اور بودھ مت کے سخت دشمن تھے خاص کر بلال سین کے عہد حکومت میں مشہور ہے کہ بنگالے کے ہندووں کی ازسرنو ذات بندی عمل میں آئی اور برہمنوں کو نیپال، اراکان وغیرہ مختلف صوبوں میں بھیجا گیا کہ وہاں اپنے مذہب کی اشاعت کریں۔ ۱۱۱۹ء میں جب بلال سین مرا تو اس کا بیٹا لکشمن سین وارثِ تاج ہوا۔ مسلمان

مورخوں نے اس کا نام رائے لکھمنی لکھا ہے اور اس کی نیکدلی کی بہت سی روایتیں مشہور ہیں۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ اِن تمام خوبیوں کے باوجود وہ مُلک داری کی قابلیت نہ رکھتا تھا اور جب اسلامی سپہ سالار محمدؐ بن بختیار خلجی صرف چند سواروں سے اچانک اُس کے محل میں گھُس آیا تو وہ ننگے سر اپنے محل سے بھاگا اور مُلک پر بلا دقت مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا؛

باب یازدہم

پہلی فصل۔ دکن کی ریاستیں

اگرچہ بعض اوقات نربدا ندی کے جنوب میں تمام جزیرہ نمائے ہند پر "دکن" کا اطلاق کر دیتے ہیں، لیکن درحقیقت مسلمانوں کے عہد میں اس لفظ نے ایک حد تک اصطلاحی شان پیدا کر لی تھی اور دریائے کرشنا اس کی جنوبی سرحد سمجھا جاتا تھا جس کے سوسوا سو میل جنوب میں بڑھکر "تامل کام" یعنی سرزمینِ تامل آ جاتی ہے اور وہ پہاڑیاں جو مدراس کے شمال سے ہلالی شکل میں کوہ نیلگری تک آئی ہیں "جنوبی ہند" کی حدِّ فاصل ہیں؛ مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ دریا اور پہاڑ سے بڑھ کر جو چیز کسی ملک کو دوسرے ممالک سے جُدا کرتی ہے وہ وہاں کے باشندوں کی قومی خصوصیات ہیں اور نسل و زبان کے لحاظ سے بھی "تامل کام" کے باشندے اپنے شمالی ہمسائوں سے متمیز ہیں، اسی بنا پر ہم اس فصل میں "دکن کی ریاستوں" سے صرف وہ ریاستیں مراد لیں گے جو کرشنا کے شمال میں تھیں۔ البتہ میسور کو جنوب میں ہونے کے باوجود دکن میں شامل کرنا پڑا کیونکہ دورِ وسطیٰ میں اس ریاست کا جو تعلق اہل شمال کے ساتھ رہا وہ جنوبی ہند

والوں سے نہ تھا؛

لیکن جزیرہ نمائے ہند کی تاریخ کو شروع کرنے سے پہلے ہمیں اِس مضمون کی مشکلات پیش نظر رکھنی چاہئیں جنھیں قدیم تاریخ ہند کے مشہور مؤلف ونسنٹ اسمتھ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے :۔" اگرچہ تحقیقاتِ جدید کی یہ بڑی کامیابی ہے کہ اُس نے جزیرہ نمائے ہند کی قدیم تاریخ کو جوڑ کر اُس کا ڈھانچہ تیار کرلیا ہے لیکن اِن خالی ہڈیوں پر ہر جگہ گوشت پوست چڑھاکر مسلسل تاریخ کی صورت میں پیش کرنا محال ہے۔ ماہرینِ آثار قدیمہ کی قابلِ تعریف کوشش اور دیدہ ریزی سے جو نتائج حاصل ہوئے ہیں، اُن سے فائدہ اُٹھانا گو ناگزیر ہے مگر تاریخ کے معمولی طالب علم کے لئے وہ زیادہ دلچسپ نہیں ہو سکتے اور نہ اُن کا یاد رکھنا آسان ہے۔ خاص کر جنوبی ہند کے فرماں روا اور مشاہیر کے اکثر نام ایسے طویل و ثقیل ہیں کہ اُن کا محفوظ رکھنا بہت دشوار ہے × × × × × دوسرے یہاں کی ریاستیں بیرونی دنیا سے کچھ ایسی بے تعلق تھیں کہ اُن کے تفصیلی واقعات صرف مقامی تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں کے کار آمد ہو سکتے ہیں۔ غرض یہ اور دیگر وجوہ ایسی موجود ہیں کہ زمانہ وسطیٰ کی ان جنوبی ریاستوں کا حال لکھنا، شمالی ریاستوں کی پیچیدہ تاریخ لکھنے سے بھی کہیں زیادہ مشکل ہے ..."

خاندان چالوکیہ کا فروغ

ان مشکلات کے باوجود، اس کتاب میں جنوبی ہندوستان کی بعض بڑی بڑی ریاستوں کا حال بیان کرنا ضروری ہے اور

اس کا سلسلہ ہمیں آندھر خاندان سے ملا دینا چاہئے جس کے دکنی راجاؤں کا پہلے ذکر آچکا ہے۔ لیکن اس خاندان کے زوال اور خاتمے کے بعد، جس کے تفصیلی واقعات کا علم نہیں، دکن کی تاریخ کے متعلق ہماری معلومات بہت ناقص ہے اور اگر بعض چھوٹی چھوٹی ریاستوں یا حکمراں خاندانوں کا پتہ چلتا بھی ہے تو ان کے صرف نام ہی نام رہ گئے ہیں[1]۔ اور سچ پوچھئے تو عہدِ وسطیٰ کی جو کچھ بُری بھلی تاریخ موجود ہے وہ چالوکیہ خاندان کے عہدِ فروغ سے شروع ہوتی ہے؛

اس خاندان کے راجہ خالص راجپوت ہونے کا دعویٰ کرتے تھے اور اس میں شک نہیں راجپوتوں کا قبیلہ "سولنکی" (چالوکیہ = چالوکی = سولنکی) اب تک اسی نام سے راجپوتانے میں آباد ہے۔ چونکہ یہ سولنکی بعض شہادتوں سے پریہاروں کے ہم نسل ثابت ہوئے ہیں، لہذا ونسنٹ اسمتھ کی رائے ہے کہ اگرچہ خاندانِ چالوکیہ غالباً

---

[1] ان میں کدمب اور گنگ خاندان کے نام زیادہ مشہور ہیں، جن کی موجودہ میسور کے علاقے میں حکومتیں قائم تھیں۔ پہلے خاندان کی قدامت اشوک کی کتبات سے ثابت ہے مگر تیسری سے چھٹی صدی عیسوی تک اس کے عروج کا زمانہ سمجھنا چاہئے۔ دوسرے یعنی گنگ خاندان کے راجہ گیارھویں صدی تک میسور کے بڑے حصے پر حکمران اور دکن کی لڑائیوں میں حصے لیتے رہے۔ اور اسی خاندان کی ایک شاخ چھٹی صدی سے سولھویں صدی عیسوی تک ملک اڑیسہ پر فرماں روائی کرتی رہی؛

راجپوتانے سے دکن میں آیا مگر نسلاً گوجروں ہی کی اُس شاخ میں ہے جو "چاپ" کے نام سے موسوم تھی ۔ ؎۱

پل کیسن اوّل دوم

بہر حال اس خاندان کا بانی پل کیسن (اول) Pulakesin ہوا ہے جس نے چھٹی صدی کے وسط میں شہر واتاپی پر قبضہ کیا اور ایک آزاد ریاست کی بنیاد ڈالی۔ (یہ بستی جو آج کل بادامی کہلاتی ہے موجودہ بیجاپور کے ضلع میں واقع ہے) ابتدا میں یہ ریاست بہت چھوٹی تھی مگر بانیٔ خاندان کو ابھی سے مہاراج ادھی راج بننے کا ارمان تھا اور بیان کرتے ہیں کہ اُس نے "اشومیدھ" کی رسم منائی تھی ؛ اس کی وفات کا ٹھیک سن معلوم نہیں لیکن اس کے دو بیٹوں نے اپنے عہدِ حکومت میں حدودِ مملکت کو وسعت دی اور ساتویں صدی کے آغاز سے پہلے واتاپی ایک بڑی ریاست کا پائے تخت بن گیا ؛ پل کیسن اوّل کا دوسرا بیٹا منگلس مرا تو سلطنت کے لئے اس کی اولاد میں سخت خانہ جنگی بپا ہوی اور آخر اُس کا بھتیجا پل کیسن (ثانی) سب حریفوں پر غالب آکر تخت کا مالک ہوگیا (سنہ) یہی وہ راجہ ہے جس نے قنوج کے راجہ ہرش کے لشکرِ عظیم کو نربدا کے کنارے روکا اور تمام شمالی دکن پر تسلط حاصل کرلیا تھا۔ کہتے ہیں کہ گجرات اور مالوے بلکہ راجپوتانے تک کے راجہ اس سے ڈرتے تھے اور جنوبی ہند کی لڑائیوں میں بھی اوّل اوّل وہی کامیاب ہوتا رہا ؛ اس کی جنگی قوت اور وفادار

؎۱ ارلی ہسٹری ہس۔ صفحہ ۴۲۴

فوج کا ہوئین چوئنگ چینی نے بھی ذکر کیا ہے جو ۶۴۱ء میں پل کیسن کے دربار میں آیا تھا۔ اور اس زمانے میں معلوم ہوتا ہے کہ اس راجہ نے ناسک یا اس کے قریب کسی مقام کو اپنا مستقر بنا لیا تھا جس کا غالباً بڑا سبب یہ تھا کہ جنوب مشرق میں اُس کے بھائی نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا اور ۶۱۵ء سے وہاں علیحدہ ریاست قائم ہو گئی تھی۔ اس حصۂ ملک کو ونگی کہتے ہیں اور اس کا پائے تخت پشت پور تھا جو پتھا پورم کے نام سے گوداوری کے ضلع میں ابھی تک آباد ہے۔

مگر پل کیسن کو آخری اور سب سے بڑی زک اپنے جنوبی دشمنوں کے ہاتھ سے پہنچی اور پلوی (Pallava) خاندان کے راجہ نرسنہ ورمن نے ۶۴۲ء میں شکست دے کر اس کا تمام ملک چھین لیا۔ غالباً اسی لڑائی میں وہ مارا گیا اور تیرہ برس تک یہ سلطنت شہر کانچی کے پلوی راجاؤں کے قبضے میں رہی۔ اور گو ۶۵۵ء میں پل کیسن (ثانی) کے بیٹے نے اپنی موروثی ریاست پر دوبارہ قبضہ کر لیا لیکن پلویوں سے ایک صدی تک برابر جنگ ہوتی رہی جس نے رفتہ رفتہ چالوکیہ خاندان کے راجاؤں کو کمزور کر دیا اور ۷۵۳ء میں ایک نئے خاندان نے ان کی رہی سہی قوت خاک میں ملا دی۔

راشٹرکوٹ

یہ خاندان راشٹرکوٹ کہلاتا ہے اور اس کا پہلا راجہ دنتی درگا ہوا ہے جس نے غالباً ۷۶۰ء میں واتاپی پر قبضہ کر لیا۔ دنتی درگا کو اس کے چچا کرشنا (اول) نے معزول کیا اور بعض جنگی فتوحات حاصل کرنے کے علاوہ ایلورا میں وہ عظیم الشان کوہ تراشیدہ

مندر بنوایا جو "کیلاش" کے نام سے مشہور ہے۔ اس خاندان کے چوتھے اور پانچویں راجاؤں نے سلطنت کو اور وسعت دی اور کوہستان بندھیا چل سے تنگ بھدر ندی تک تمام دکن کو فتح کر لیا۔ مگر چالوکیہ خاندان کی مشرقی شاخ ابھی تک صوبۂ ونگی کی مالک تھی اور خاندان راشٹرکوٹ (یا رٹا) کا چھٹا راجہ اموگھ ورش (Amoghavarsha) بہت دن تک اس سے اُلجھتا رہا۔ کہتے ہیں کہ یہ راجہ ۸۱۵ء سے شاید ۸۷۷ء تک یعنی باسٹھ سال سریر آرائے ریاست رہا اور اس کی دولت و قوت کا عینی گواہ ایک عرب تاجر ہے جو نویں صدی کے وسط میں ادھر آیا تھا۔ واضح رہے کہ جنوبی گجرات اور ہندوستان کے مغربی سواحل انہی دکنی بادشاہوں کے قبضے میں تھے اور چونکہ وہ اپنی رعایا کی مرفہ الحالی خاص کر تجارت کی ترقی میں ساعی رہتے تھے لہذا سندھ کے عرب تاجروں پر، جن کے ہاتھ میں اُس وقت ہند کی بحری تجارت تھی، وہ بہت مہربان تھے۔ اسی تجارت کے سلسلے میں وہ عرب سوداگر (سلیمان) دکن آیا اور معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت اموگھ ورش اپنا پائے تخت مانی کھیت میں منتقل کر چکا تھا جو آج کل مال کھیڑ کے نام سے ممالک محروسہ سرکار عالی میں داخل ہے۔

اس خاندان کا ایک اور نامی راجہ اندر (ثالث) ہوا ہے جس نے شمالی ہندوستان پر فوج کشی کی اور قنوج کے راجہ کو شکست دے کر اس کا پائے تخت چھین لیا۔ لیکن اس

اولوالعزمی اور فتوحات کے باوجود اس راجہ نے زیادہ عمر نہ پائی اور صرف دو سال سلطنت کرکے فوت ہوگیا (۹۱۶ء)

چالوکیہ خاندان کا دوسرا دور

راشٹرکوٹ خاندان کا آخری فرماں روا گک (یا کلہ) تھا اور اسے ۹۷۳ء میں قدیم چالوکیہ خاندان کے ایک سردار نے شکست دے کر دوبارہ اپنی سلطنت قائم کرلی۔ مگر پہلی اور دوسری سلطنت میں فرق رکھنے کی غرض سے ان متاخرین کو چالوکیان کلیانی کے نام سے موسوم کرتے ہیں، کیونکہ اس دوسرے خاندان کے بانی راجہ تیل یا تیلپ (Taila) نے ممالک محروسہ کے موجودہ ضلع بیدر میں شہر کلیانی کو خود بسایا اور اپنا پائے تخت بنالیا تھا۔

تیل نے چوبیس برس حکومت کی اور گجرات کے سوا تمام علاقہ جو پہلے کسی وقت سلطنت چالوکیہ میں داخل تھا، فتح کیا۔ جنوبی مالوے میں اس کی دھار کے راجہ مُنج سے کئی لڑائیاں ہوئیں اور اوّل اوّل سب معرکوں میں فتح مُنج کو حاصل ہوتی رہی۔ آخری مرتبہ خود مُنج اپنے حریف کے علاقے میں گھس آیا تھا کہ تیل کی فوجوں نے اُسے گھیر لیا شمالی حملہ آوروں کو شکست ہوی اور اُن کا راجہ مُنج گرفتار ہوگیا۔ کہتے ہیں کہ اس معزز قیدی کے ساتھ تیل نے ابتدا میں شاہانہ سلوک مرعی رکھا لیکن جب اس نے بچ کر نکل جانے کی سازش کی تو پھر اُس پر بڑی سختیاں کیں اور جبر سے در در بھیک منگوانے کے بعد اس کا سرقلم کرا دیا۔ (قیاساً ۹۹۵ء)

تیل کے بیٹے ستیاس رائے (Satyasraya) کے عہد میں چولا خاندان کے جنوبی فرماں روا راج راج (Rajaraja) نے چالوکیہ سلطنت پر چڑھائی کی - حملہ آوروں کی تعداد نوّے ہزار بتائی گئی ہے اور حسبِ روایتِ عام اُنہوں نے دشمن کے ملک میں چاروں طرف تباہی پھیلا دی تھی - یہاں تک کہ عورتوں بچّوں اور برہمنوں کو بھی نہ چھوڑا اور سخت ظلم کئے ؛

پچاس برس بعد سُمیش ور (اوّل) (Somesvara) نے اس ذلّت کا بدلہ لیا اور دریائے کرشنا کے کنارے چولا کے فرماں روا کو شکست دی (۱۰۵۲ء) پھر اُس نے اس جنوبی ریاست کے پائے تخت کانجی کو ہلّہ کر کے چھین لیا اور بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ برار اور مالوے میں بھی نمایاں فتوحات حاصل کیں گویا چالوکیہ خاندان کی گزشتہ عظمت کی یاد تازہ کر دی ؛ اس راجہ کی موت کے متعلّق یہ قصہ مشہور ہے کہ اُسے تپ کہنہ سے شفایاب ہونے کی امید نہ رہی تھی لہٰذا خودکشی کا ارادہ کیا اور شِوجی کے نام کا کلمہ پڑھ کر تنگ بھدر میں کود پڑا اور ڈوب کر جان دے دی (۱۰۶۸ء)

اس کا دوسرا جانشین وکرمادتیہ (رابع) یا راجہ بکرمانک گزرا ہے جس کی رزم و بزم کے واقعات بلہن شاعر نے نظم کئے تھے اور حال میں وہ نظم دستیاب ہوی ہے ؛ اس راجہ نے اپنے بھائی سے لڑ کر سلطنت چھینی تھی اور جب دوسرے بھائی نے خود اُس پر بھی وار چلانا چاہا تو بکرمانک نے باغی کو شکست دی اور

۱۰۷۶ء سے ۱۱۲۶ء تک بڑی شان کے ساتھ فرماں روائی کرتا رہا۔ جنوبی حریفوں سے اس کی اکثر جنگ رہتی تھی - ان معرکوں میں قسمت مساعد رہی اور وہ کئی بار کانچی پر قابض ہو ہو گیا تھا۔ اس کی ناموری کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ مشہور قانونی کتاب "متاکشرا" کا مصنف اس کا ہم عصر تھا اور کلیانی ہی میں بیٹھ کر اُس نے یہ کتاب تحریر کی تھی جو بنگالے کے سوا ہندوستان کے تمام علاقوں میں آج تک ہندو قانون کی مستند کتاب مانی جاتی ہے۔

اس راجہ کے بعد چالوکیانِ کلیانی کی قوت میں زوال آگیا اور تیل ثالث کے زمانے (۱۱۵۶ء تا ۱۱۶۲ء) میں بجن یا بجّل نامی سپہ سالار نے سلطنت غصب کر لی[1] ۱۱۸۳ء تک وہ اور اس کی اولاد مُلک پر قابض رہی اور گو چالوکیہ خاندان کے ایک راج کُمار نے پھر تھوڑا سا علاقہ چھین لیا تھا لیکن اب شمال اور جنوب سے دو نئی ریاستوں نے اس پر نرغہ کیا اور چند سال میں یہ تمام سلطنت دیوگری اور دوار سمُدر کے راجاؤں نے آپس میں تقسیم کر لی - چالوکیہ خاندان کے راجہ باقی رہے بھی تو اب اُن کی حیثیت معمولی جاگیرداروں کی سی تھی

[1] اس کے عہد میں "ویرسیوا" فرقے کی ابتدا ہوئی جو ہندو مت کے اصولی عقائد سے منکر ہے اور برہمنوں سے نفرت رکھتا ہے۔ اس فرقے کے لوگ جینیوں کے بھی سخت مخالف ہو گئے تھے (اوکس ص ۲۰۳)

اور سلطنت پر جادو یا ہوے سل خاندان کے راجاؤں کا قبضہ ہوگیا تھا۔ (۱۱۹۰ء)

خاندان ہوے سل

اس خاندان (Hoysala) کو بارھویں تیرھویں صدی میں فروغ حاصل ہوا۔ اس کی راج دھانی دور سمدر (علاقہ میسور) میں تھی اور اگرچہ شہر کی بجائے اب وہاں ہل بیڑ نامی ایک چھوٹا سا موضع رہ گیا ہے، لیکن انہیں کھنڈروں میں بعض عالیشان عمارتیں ابھی تک اپنے دولت مند بانیوں کی یادگار ہیں۔ خاص کر وہ مندر ہندوستان کے قابل دید آثار میں شمار ہوتا ہے جسے بانی خاندان راجہ بٹیگا نے تعمیر کرایا تھا۔ یہ راجہ (۱۱۱۱ء تا ۱۱۴۱ء) چالوکیہ سلطنت کا باج گزار اور اول اول جین مت کا پیرو تھا لیکن بعد میں دکن کے مشہور ہندو عالم رامانج کی تلقین کے اثر سے وشنو کا پرجوش پرستار ہوگیا اور اسی فرقے کے لئے اس نے جا بہ جا بہت سے مندر تعمیر کرائے۔

اس راجہ کے پوتے بیر بلال (Viraballala) کے عہد میں ریاست نے بڑا عروج حاصل کیا (۱۱۷۳ء تا ۱۲۲۰ء) وہ نہ صرف اپنے ملک کا خود مختار حاکم بلکہ جنوبی ہند کا غالباً سب سے طاقتور فرماں روا گزرا ہے اور ۱۳۱۰ء تک راجگان دور سمدر کا یہ اقتدار قائم رہا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ اسلامی سپہ سالار ملک کافور اور خواجہ حاجی دیوگری کے سرکش راجہ کو سزا دینے دکن پر حملہ آور ہوئے اور فتح مندوں کا یہی سیلاب خاندان ہوے سل کو بہا لے گیا۔ ۱۳۲۶ء میں جب مسلمانوں نے

دوسری مرتبہ دور سمدر کو فتح کیا تو اس خاندان کی خود مختار بادشاہی کا بھی خاتمہ ہوگیا ؛

دیوگری کے

دیوگری (موجودہ دولت آباد) کی ریاست سلطنت چالوکیہ کی باج گزار تھی لیکن یہ سلطنت کمزور ہوی تو وہاں کے رئیس خود مختار ہو گئے - یہ جادو (Yadava) خاندان کے راجہ کہلاتے ہیں اور تیرھویں صدی کے شروع میں ان کے راجہ سنگھن نے اس ریاست کو بہت وسیع و قوی بنا دیا تھا ؛ لیکن یہ عروج چند روزہ تھا کیونکہ اوّل تو دکن کے راجاؤں کو باہمی جنگ و جدال سے فرصت نہ تھی دوسرے تیرھویں صدی کے ختم ہونے سے پہلے مسلمانوں کی آمد شروع ہوگئی اور ۱۳۰۹ء میں یہ شمالی ریاست مستقل طور پر شاہان دہلی کا صوبہ بن گئی -

---

دوسری فصل - جنوبی ریاستیں

ہندوستان کے سب سے جنوبی مثلث میں قدیم سے تین سلطنتوں کا پتہ چلتا ہے : پانڈیا - چیرا (یا کرالا) اور چولا - پہلی کا ذکر مگاس تھنیز نے اپنی کتاب الہند میں کیا ہے - اشوک کی کتبات میں تینوں بلکہ ایک چوتھی ریاست کرال پترا کا نام بھی آتا ہے جو سب سے قدیم تھی اور آخر میں پانڈیا کا جزو بن گئی - ان تینوں میں سب سے جنوبی یہی ریاست پانڈیا تھی

اور اس کے مغرب میں موجودہ کوچین تک ریاست چیرا کا علاقہ تھا۔ ساحل کورومنڈل اور میسور کا مشرقی علاقہ ریاست چولا میں داخل تھا اگرچہ باہمی جنگ و جدال آے دن ان ریاستوں کی حدود کو بدلتی رہتی تھی۔ ان ریاستوں کے تاریخی واقعات بالکل تاریکی میں ہیں۔ اگرچہ اس بات کے ثبوت موجود ہیں کہ یہ قدیم سے متمدن ریاستیں تھیں اور یہاں کا تجارتی مال دُور دُور تک جہازوں میں جاتا تھا۔ تامل زبان میں پہلی اور دُوسری صدی عیسوی کی کئی نظمیں محفوظ ہیں۔ ملیالم زبان کا اس وقت تک رواج نہیں ہوا تھا اور جنوبی ہند میں ہر جگہ تامل بولی جاتی تھی۔ شہر مدورا اس کے قدیم علم ادب کا مولد و منشا مانا جاتا ہے جہاں شعرا کا مجمع رہتا تھا۔ اس زبان کی قدیم نظموں میں سب سے زیادہ مشہور۔ کورل، سلپ دھکارم اور مینمے کھلے ہیں اور اب تینوں کا انگریزی میں ترجمہ ہو گیا ہے۔ کورل میں اخلاق اور صفات حسنہ کی تعلیم ہے۔ سلپ دھکارم (یعنی چُوڑی کی داستان) اور مینمے کھلے (یعنی "عقدِ جواہر") محض قصّے ہیں جن سے اس زمانے کے مذہب اور تمدّن کا پتہ چلتا ہے۔ بہت سے شعرا اور امیروں کا بھی ان میں ضمناً ذکر آ گیا ہے اور انہی کی بنا پر بعض اہل تحقیق نے جنوبی ریاستوں کے تاریخی حالات کا کچھ سراغ لگایا ہے۔ لیکن یہ حالات سنین کے اعتبار سے مسلسل نہیں اور اسی لئے پانچویں صدی عیسوی تک جب کہ جنوبی ہند میں ایک نئی قوم کو عروج ہوا درحقیقت

ان ممالک کی کوئی تاریخ نہیں ہے

پالوا یا پلوی
یہ نئی قوم تاریخ میں پالوا (Pallava) یا پلو کے نام سے موسوم ہے اور ہم تلفظ کی آسانی کے لئے اسے پلوی کہنے لگے ہیں اور اس میں یہ خیال بھی مضمر ہے کہ غالباً یہ لوگ پہلوی یا پارتھی نسل سے تھے۔ مگر ونسنٹ اسمتھ اس خیال کو صحیح نہیں جانتا اور اس کے نزدیک یہ جنوبی ہند ہی کی کوئی جنگلی قوم تھی جس نے پانچویں صدی میں ریاست چولا کا شمالی علاقہ فتح کر لیا اور مستقل طور پر اپنی ایک ریاست علیحدہ قائم کی جس کا پائے تخت کانچی (یا کنجی ورم) تھا: پھر چھٹی صدی عیسوی میں انہیں یہ اقتدار حاصل ہوا کہ جنوبی ہند کے سب فرماں روا کسی حد تک ان کے زیر دست ہو گئے یا کم سے کم ان سے خوف زدہ رہنے لگے تھے: ایک کتبے میں سمہا وشنو دعویٰ کرتا ہے کہ اُس نے چیرا، چولا، پانڈیا اور لنکا کے بادشاہوں کو شکست دی۔ اور یہ پلوی خاندان کا راجہ چھٹی صدی عیسوی کے آخری ربع میں فرماں روائی کرتا تھا: دیگر شواہد سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اپنے عین عروج کے زمانے میں اس خاندان کے راجہ اڑیسے کی سرحد سے پونیار یا پنیار ندی تک جزیرہ نمائے ہند کے مشرقی ساحل پر قابض تھے اور مشرقی میسور اور شمالی دکن کے راجہ ان کی سیادت تسلیم کرتے تھے۔ اگرچہ براہ راست اُن کی حکومت صرف اس علاقے پر تھی جو آج کل ارکاٹ، مدراس، ترچناپلی اور تنجور کے انگریزی اضلاع میں داخل ہے: ساتویں صدی میں

چالوکیہ خاندان کے راجاؤں نے اُن سے شمالی علاقہ (ونگی) چھین لیا تھا بایں ہمہ دو صدی تک ان کی قوّت بنی رہی اور اسی زمانے میں اُن کے راجاؤں نے وہ قابل دید عمارات بنوائیں جو آج بھی اُن کی دولت وحشمت کی گواہی دیتی ہیں ؛

مہندر ورمن اور نرسمہاورمن

پلویوں کے مشہور بادشاہوں میں پہلا مہندر ورمن (اول) گزرا ہے جو غالباً ساتویں صدی کے آغاز میں فرماں روائی کرتا تھا۔ اُس نے بعض کوہ تراشیدہ منادر بنوائے اور "مہندرواڑی" کے کھنڈر آج بھی اس کا نام یاد دلاتے ہیں ؛ یہ شہر اس نے موجودہ ارکاٹ کے کچھ شمال میں آباد کیا اور اس کے قریب بہت بڑا تالاب بنوایا تھا۔ چالوکیہ خاندان کے راجہ پل کیسن (ثانی) نے غالباً ۶۱۰ء میں اسی کو شکست دی اور علاقہ ونگی چھین لیا یہاں اس خاندان کی ایک دوسری شاخ نے اپنی ریاست علیحدہ قائم کی تھی۔ اور اس کا ذکر پچھلی فصل میں ہماری نظر سے گزر چکا ہے۔ راجہ مہندر پہلے جین مت کا پیرو تھا مگر پھر "ویرشیو" فرقے کا معتقد اور اپنے پچھلے مذہب کا دشمن ہوگیا۔ چنانچہ جنوبی ارکاٹ میں جینیوں کی ایک بڑی خانقاہ اُسی نے منہدم کرا دی تھی ؛ مگر پلویوں کا سب سے اقبالمند فرماں روا نرسمہاورمن گزرا ہے جو مہندر کا جانشین تھا اور قیاساً ۶۲۵ء سے ۶۴۵ء تک حکومت کرتا رہا۔ اُس نے چالوکیہ خاندان کے راجہ سے پچھلی ہزیمت کا بدلہ لیا اور پل کیسن کو شکست فاش دی۔ شاید اسی لڑائی میں یہ چالوکی راجہ مارا گیا اور اس کے پائے تخت پر

پلویوں کا قبضہ ہو گیا؛ (۶۴۲ء)

چینی سیاح ہوئین چوئینگ اسی راجہ کے زمانے میں اس طرف آیا اور چونکہ لنکا میں ان دنوں خانہ جنگی اور کشت و خون کا ہنگامہ برپا تھا اس لئے ہوئین چوئنگ نے وہاں جانے کا قصد ملتوی کیا اور کانچی ہی سے شمال میں واپس چلا گیا؛ اس کے سفرنامے سے معلوم ہوتا ہے کہ گو اس وقت جنوبی ہند میں بودھ مت کے درویشوں کی بہت سی خانقاہیں موجود تھیں[1] لیکن عام طور پر جین مت کے فرقے "دگمبرا" کا زور تھا اور "ویرشیو" کا نیا فرقہ بھی بہت تیز ترقی کر رہا تھا؛

مگر نرسمہا ورمن کی سب سے بڑی وجہ شہرت یہ ہے کہ اس کے زمانے میں نقاشی اور فنِ عمارت کو فروغ ہوا۔ مامل پورم نامی شہر کی بنا اسی نے ڈالی تھی اور وہاں ابتک وہ عالیشان "ہفت منادر" موجود ہیں جنھیں پہاڑ تراش کر بنایا گیا تھا۔ ان کو فن تعمیر و کوہ تراشی کی لاجواب یادگار مانا جاتا ہے۔ اور انہیں مندروں کے اندر چٹان کو تراش کر دیوی دیوتاؤں کی مورتیں بنائی ہیں یہ کام اتنے وسیع

---

[1] ان خانقاہوں کو توڑ پھوڑ کر بعد میں ہندوؤں نے ان کی بجائے اپنے بت خانے بنائے تھے۔ حال ہی میں کنجی ورم کے بعض مندروں سے گوتم بودھ کی مورتیں دستیاب ہوی ہیں اور ونسنٹ اسمتھ کو یقین ہے کہ آئندہ تحقیقات سے بودھ مت کے اور بہت سے "آثارِ باقیہ" اس علاقے میں دریافت ہوں گے؛ (اوکس ہس۔ ۹-۲)

پیمانے پر شروع کیا گیا تھا کہ نرسمہا کی زندگی میں اتمام کو نہ پہنچا اور اس کے جانشینوں کو ہمسایوں کی یورشوں نے اتنی مہلت نہ دی کہ اسے آخر تک جاری رکھ سکتے دوسرے ان کے شوقِ تعمیر کے لئے اور مقامات تھے جہاں انہوں نے آٹھویں صدی کے اوائل میں بہت سی عمارتیں بنوائیں؛ مگر زوال گویا دولت و اقبال کی تاک میں رہتا ہے۔ پلویوں کی قوت کو عروج پر پہنچے زیادہ مدت نہ ہوی تھی کہ اُن کے زوال کے آثار نظر آنے لگے؛ عروج کے زمانے میں انہوں نے اپنے ہمسایوں کو خوب ستایا تھا اب خود ان کے ستائے جانے کی باری تھی چنانچہ آٹھویں اور نویں صدی میں شمال و جنوب کے رقیبوں نے انہیں بار بار شکستیں دیں اور نویں صدی کے ختم ہونے سے کچھ عرصے پہلے چولا خاندان کے راجا آدِتیا نے شکست فاش دے کر ان کی خود مختاری کا خاتمہ کر دیا۔ بعد میں کئی صدی تک ہم اُن کے مقامی راجاؤں کا کہیں کہیں نام سنتے ہیں مگر ان کی حیثیت معمولی جاگیرداروں کی سی تھی اور غالباً سترھویں صدی کے اخیر تک اس قوم کا نام فقط تاریخ کے اوراق میں رہ گیا؛

چولا خاندان

پلویوں کا خاتمہ، چولا خاندان کی صحیح تاریخ کا آغاز ہے یعنی صحتِ سنین کے لحاظ سے آدِتیا کا بیٹا پران تک (اوّل) پہلا راجہ ہے جس کی جانشینی اور وفات کی ٹھیک تاریخ بتائی جا سکتی ہے۔ وہ ۹۰۷ء میں تخت نشین ہوا اور بیالیس برس تک حکومت کرتا رہا۔ عہد حکومت کی درازی کے علاوہ اس کے اقبال مند

ہونے کی بڑی دلیل یہ ہے کہ اُس نے اپنے جنوبی حریفوں کو زیر کیا۔ پانڈیا خاندان کا راجہ شکست کھا کے وطن سے نکل گیا۔ پائے تخت مدورا پر فتحمندوں کا قبضہ ہوگیا اور پران تک نے آگے بڑھ کر لنکا میں فوج اُتاری ؛

جنوبی ہند کی ان ریاستوں میں باہم' اور لنکا والوں کے ساتھ آئے دن لڑائی ہوتی رہتی تھی اور کبھی ایک فریق غالب آجاتا تھا کبھی دوسرا۔ لیکن راج راج دیو Rajaraja Deva کے زمانے میں چولا خاندان کو جو غلبہ حاصل ہوا اس میں کم سے کم نصف صدی تک کوئی کمی نہ آئی اور اُس عہدِ انقلابات میں یہ کچھ معمولی بات نہ تھی؛ ان کے اس عہد عروج کا آغاز ۹۸۵ء سے ہوتا ہے جب کہ خانہ جنگی' قتل اور سازشوں کے ایک طویل سلسلے کے بعد راج راج تخت نشین ہوا اور خاتمہ ۱۰۳۵ء کو سمجھنا چاہئے جو اُس کے بیٹے راجندر کی وفات کا سال ہے؛ اس تمام مدت میں پانڈیا خاندان کے راجہ طوعاً وکرہاً اپنے شمالی ہمسایوں کی سیادت تسلیم کرتے رہے اور انہیں جنوبی ہند کی تیسری ریاست پر حملہ کرنے کی فرصت ملی؛ چنانچہ ۹۹۳ء میں راج راج نے چیرا خاندان کے مُلک[1] پر

[1] واضح رہے کہ ان ملکوں اور اُن کے شاہی خاندانوں کے نام ایک ہیں یعنی چیرا' چولا اور پانڈیا (یا پانڈیاں) کے لفظ کا جس طرح اُن کے خاندانوں پر اطلاق ہو سکتا ہے اسی طرح اُن کے علاقے بھی انہیں ناموں سے منسوب کردئے جاتے ہیں ؛ ۱۲

فوج کشی کی اور موجودہ کورگ کا علاقہ فتح کر لیا۔ پھر اس نے جانب شمال پیش قدمی کی اور ونگی کے چالوکی راجاوں کا قلع قمع کیا جو پلویوں سے چھین کر کئی صدی سے اس علاقے کے مالک بنے ہوئے تھے۔ راج راج کی شمالی فتوحات کی حد اڑیسے کو سمجھنا چاہیئے جس کے جنوبی حصّے پر اُس کا قبضہ ہو گیا تھا۔ جنوب میں اس اقبالمند راجہ نے لنکا سے خراج وصول کیا اور ایک بڑا جنگی بیڑا بنا کے قریب کے بعض جزائر فتح کر لئے۔ پھر بیس برس تک شمشیر زنی اور مسلسل فتوحات کے بعد اُس نے تلوار ہاتھ سے رکھی تو موجودہ "احاطۂ مدراس" کا قریب قریب تمام علاقہ سلطنت چولا میں شامل تھا۔

راج راج نے اپنی زندگی کے باقی دن امن و امان کے مشغلوں میں بسر کئے اور اپنے صدر مقام تنجور میں وہ عالیشان مندر تعمیر کیا جس کی دیواروں پر اس کے جنگی کارنامے کندہ ہیں۔ یہ عمارت اب تک اپنے نامور بانی کی یاد دلاتی ہے۔ اور اسی ضمن میں یہ لکھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ خود وشنو کے پرستار ہونے کے باوجود اُس نے بودھ مت والوں کے لئے بھی ایک مندر تعمیر کرا دیا تھا اور پندرھویں صدی تک لوگ اس کی زیارت کرنے آتے تھے۔ ۱۸۶۲ء میں رومن کیتھولک پادریوں نے اُسے کس مپرسی کی حالت میں دیکھ کر خود قبضہ کیا اور تڑوا کر اپنی عمارتیں

بنوائیں[۱]

12 راج راج کے بعد جب اس کا بیٹا راجندر (اوّل) تخت نشین ہوا (۱۰۱۸ء) تو پھر جنوبی ہند کے سپاہیوں کی تلواریں جو اتنے دن سے میان میں پڑی پڑی زنگ آلودہ ہوی جاتی تھیں مختلف میدانوں میں چمکنے لگیں۔ اس علاقے کا یہی راجہ ہے جس نے شمال میں بنگالے تک یلغار کی اور تنجوری سواروں کے گھوڑوں کو گنگا کا پانی پلا دیا۔ یہ ۱۰۲۳ء کے قریب کا واقعہ ہے اور اس وقت بنگالے میں مہی پال فرماں روا تھا جسے راجندر نے شکست دی۔ مگر ایسی فتح کا کوئی دیرپا نتیجہ نہ نکل سکتا تھا اور اس راجہ کی بحری فتوحات کا بھی یہی حال ہوا کہ گو اس کے بیڑے نے جنوبی برما تک میں چولا خاندان کا جھنڈا گاڑ دیا لیکن وہاں زیادہ عرصے ان کا قبضہ نہ رہ سکا۔ البتہ راجندر کا ان کارناموں پر فخر کرنا کچھ بیجا نہ تھا چنانچہ گنگا تک فاتحانہ پیش قدمی کی یادگار ہی میں اُس نے "گنگے گونڈ" کا لقب اختیار کیا اور موجودہ ضلع ترچناپلی میں ایک نئے پائے تخت کی بنیاد ڈالی جس کا نام "گنگے گونڈ چولاپورم" تھا۔ یہاں اس کے تعمیر کردہ محل اور عالیشان مندر کے کھنڈر اب تک موجود ہیں۔

راجندر کی وفات (۱۰۳۵ء) کے بعد اس خاندان میں

---

[۱] ارلی ہسٹری۔ صفحہ ۴۶۶

تیس پینتیس برس تک اندرونی فساد اور خانہ جنگیاں برپا رہیں۔ مگر کُشت و خون کی داستان میں یا اس زمانے کی بیرونی لڑائیوں میں کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں البتہ جب اولاد نرینہ نہ ہونے کے باعث یہ ریاست راجندر اوّل کے نواسے کے ورثے میں آئی تو کہنا چاہیئے کہ جنوبی ہند کے نصیب جاگ اُٹھے ؛

کلوٹنگ چولا

یہ راج کمار جس کی ماں ونگی کے چالوکی راجہ کو بیاہی گئی تھی، ایک طرف تو اپنے باپ کی ریاست (ونگی) کا مالک تھا اور دوسری طرف ریاست چولا اُسے ورثے میں مل گئی (۱۰۷۰ء) اور آئندہ واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ نہ صرف اُس کی بلکہ اس تمام علاقے کی خوش قسمتی تھی ؛ کیونکہ دونوں ریاستوں پر قبضہ ہونے کے بعد اس راجہ نے بیرونی فتوحات کے علاوہ اندرونی فتنہ و فساد سے رعایا کو نجات دلائی اور نظم و نسق میں مفید اصلاحیں کیں اور ۱۰۸۶ء[1] میں مالگزاری کی تشخیص اور زمین کی از سرنو پیمایش کرائی[2] ؛

---

[1] یہ لکھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ انگلستان کو جب ولیم (فاتح) نے فتح کیا تو اس کے حکم سے اُس مُلک کی پہلی مرتبہ (اگرچہ کسی قدر ناقص) پیمایش اسی سال ہوی تھی (۱۰۸۶ء)

[2] مسٹر کرشنا سوامی اینگر نے اس بات کی قدیم تحریری شہادت پیش کی ہے

بقیہ صفحہ آئندہ

اس نے "کلوٹنگ چولا" کا لقب اختیار کیا تھا مگر وہ اور اس کی اولاد "چالوکی چولا" خاندان کے نام سے تاریخ میں موسوم ہے تاکہ ان میں اور اصلی چولا خاندان میں امتیاز رہے ۔ ایک صدی سے زیادہ عرصہ تک جنوبی ہند میں اُن کی سیادت قائم رہی اور عمدہ نظم و نسق کی بہ دولت مُلک میں امن و امان و خوش حالی کا دَور دَورہ رہا۔ اس زمانے کے تمدّن کا کچھ حال اگلی فصل میں ہماری نظر سے گزرے گا۔ واقعاتِ تاریخی کے سلسلے میں یہاں یہ بتانا کافی ہے کہ تیرھویں صدی میں چالوکی چولا خاندان میں ضعف آگیا۔ ریاست پانڈیا کے خود مختار ہو جانے سے وہاں کے راجہ اور بھی کمزور ہو گئے اور آخر میں جب وجیانگر کی نئی سلطنت نے سر اُبھارا تو اُن کی سطوت کا آفتاب جو زوال کے درجے طے کر رہا تھا، غروب ہو گیا ۔

پانڈیا اور چیرا

چولا خاندان کے انحطاط نے ریاست پانڈیا کو جنوب میں سب سے طاقتور بنا دیا تھا مگر اس کا یہ عروج زیادہ عرصے نہ رہا اور مسلمانوں کے دکن میں حملہ آور ہونے کے وقت وہاں کے راجہ رفتہ رفتہ اپنی خود مختاری کھو کر معمولی جاگیر دار رہ گئے۔

اِن کی اس سے پہلے کی تاریخ میں ہمسائوں سے جنگ و جدال یا مذہبی کشت و خون کی خوفناک روایتوں کے سوا کوئی

بقیہ مضمون صفحہ گزشتہ

کہ جنوبی ہند میں اس قسم کی پیمائشیں بہت پہلے سے رواج پا چکی تھیں ۔ اس مضمون پر انکی کتاب "اینشینٹ انڈیا" کا چوتھا باب خاص طور پر قابلِ مطالعہ ہے ۔ ۱۲

کار آمد بات نہیں ملتی - مگر ان مذہبی خونریزیوں میں کم سے کم ایک واقعہ ذکر کے قابل ہے کہ ساتویں صدی عیسوی میں جب پانڈیا راجہ ندو مارن اپنی بیوی کے اثر سے جَین مت چھوڑ کر شِوجی کا معتقد ہوا تو اُس نے رعایا کو بھی اپنا نیا مذہب اختیار کرنے پر مجبور کیا اور منجملہ دیگر مظالم کے آٹھ ہزار جینیوں کی کھال کھچوالی، جنھوں نے اپنا پرانا مذہب چھوڑنے سے انکار کیا تھا۔ شہر مدورا میں ”ات سو“ نامی تہوار جو ہر سال ہوتا ہے اسی اندوہناک واقعے کی یادگار ہے[۱]۔

جنوب کی دوسری ریاست چیرا کا ہمیں اس قدر حال بھی معلوم نہیں جس قدر کہ پانڈیا کا حال معلوم ہے۔ دوسرے یہ ریاست جس میں موجودہ ٹراونکور کا علاقہ شامل تھا، زیادہ تر چولا خاندان کے طاقتور راجاؤں کے ماتحت رہی اور اس لئے خاص وہاں کے واقعات کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔

تیسری فصل - نظم و نسق اور فنون

نویں صدی سے چودھویں صدی کے آغاز تک کے جو کتبے جنوبی ہند میں دستیاب ہوئے ہیں اُن سے ریاست چولا کے ملکی انتظامات کے متعلق بہت سی باتیں معلوم ہوئیں - اور

---

[۱] اوکس ہس - صفحہ ۲۱۴

چونکہ اس ریاست کے فرماں روا بالواسطہ یا بلاواسطہ ایک حد تک تمام جنوبی ہند پر حکومت کرتے تھے، لہذا ان کے آئین کو تمام جنوبی ہند کے آئین سمجھنا، بے جا نہیں۔ ریاست چیرا کے جو کچھ بُرے بھلے حالات معلوم ہو سکے ہیں اُن سے بھی مذکورۂ بالا قیاس کی تصدیق ہوتی ہے؛ البتہ یقین کے ساتھ یہ سراغ لگانا محال ہے کہ خود ریاست چولا میں ان آئین کی ابتدا کب اور کیونکر ہوی اور کس زمانے میں کیا کیا اصلاحیں عمل میں آتی رہیں؛

الغرض، مذکورۂ بالا کتبات سے جو کچھ معلوم ہو سکا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ گو جنوبی ہند کے دیہات میں بھی پنچایت کا طریقہ جاری تھا، لیکن یہاں بالعموم ہر گاؤں کی علٰحدہ پنچایت نہ ہوتی تھی بلکہ بہت سے گاؤں مل کر ایک "کورم" کہلاتا تھا اور ہر کورم میں ایک "مہاسبھا" یا مجلس ہوتی تھی جس کے اراکین قرعہ اندازی سے منتخب کئے جاتے اور ہر سال نیا انتخاب عمل میں آتا تھا۔ اس مجلس کو جو ایک حد تک سرکاری عمّال کے ماتحت ہوتی تھی، اندرونی معاملات میں بہت کچھ اختیارات حاصل تھے اور اِس زمانے کی زبان میں، کہہ سکتے ہیں کہ پٹیل پٹواری کے فرائض وہی انجام دیتی تھی۔ گانوں والوں کے جھگڑوں کا فیصلہ اور آب پاشی کے تالاب، باغات وغیرہ کی عام نگرانی بھی اس سے متعلق تھی؛

ایسے کئی کورم مل کر ایک ضلع ("ناڈو") اور چند اضلاع مل کر ایک قسمت ("کوٹم") بنتی تھی تمام سلطنت کو

چھ صوبوں میں تقسیم کیا گیا تھا اور ہر صوبے میں ایسی کئی کئی قسمتیں (یا کوٹم) ہوتی تھیں؛ صوبے کی وسعت کا سرسری اندازہ کرنے کے لئے یہ لکھنا فائدہ سے خالی نہ ہوگا کہ خاص ریاست چولا کا علاقہ "چولا مندلم" کے صوبے میں داخل تھا اور وہ قریب قریب اِس زمانے کے دو ضلعوں (یعنی تنجور و ترچناپلی) کے برابر ہے؛

بعض چھوٹے چھوٹے ابواب کے علاوہ، سلطنت کُل پیداوار کا یک سدس، مالیہ وصول کر لیتی تھی اور ادائے مالگزاری میں زمیں دار کو اجازت تھی کہ زرِ نقد دے یا سرکاری مالیہ جنس کی صورت میں ادا کر دے اور جو طلائی اشرفی، ریاست چولا میں رائج تھی اس کا وزن ساڑھے تین ماشے کے قریب تھا؛

معلوم ہوتا ہے کہ چولا خاندان کے راجہ وسائلِ آب پاشی پر سب سے زیادہ توجہ کرتے تھے۔ انہوں نے جو تالاب بنوائے اور بند باندھے ہیں، ان کے دیکھنے سے ثابت ہوتا ہے کہ تعمیر کے اس فن میں جنوبی ہند کے لوگ طاق تھے؛ بڑی بڑی چٹانوں کو بلندی پر چڑھانے اور جمانے میں بھی انہیں کمال حاصل تھا چنانچہ تنجور کے بڑے مندر کی چوٹی پر جو پتھر کی ڈال اُنہوں نے لگائی ہے اس کا وزن، تخمیناً دو ہزار من سے بھی کچھ زیادہ ہوگا؛ ونسنٹ اسمتھ کا خیال ہے کہ اس قسم کی تعمیر میں بیگاریوں سے کام لیا جاتا ہوگا۔ لیکن رعایا کو

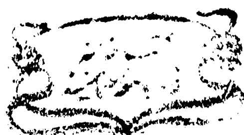
جیسی خوش حالی اور آزادی حاصل تھی، اُس کے اعتبار سے یہ خیال ہوتا ہے کہ ایسے کاموں میں وہ خوشی سے شریک ہو جاتی ہوگی۔ کیونکہ ان میں سے اکثر عمارتیں اگر اس کے فائدے کی نہ تھیں تو کم سے کم اس کے مذاق کے موافق ضرور تھیں؛

فن عمارت و سنگ تراشی

"جنوبی ہند کے فنون کی تاریخ خاص طور پر اس لئے قابل مطالعہ ہے کہ یہاں اُن پر بیرونی ممالک کا اثر نہ پڑا تھا بلکہ ان کی ابتدا اور آئندہ جو کچھ ترقی ہوی وہ سب اپنے وطن میں ہوی۔ فنون سے یہاں صرف عمارت و سنگ تراشی مراد ہیں کیونکہ نقاشی کا کوئی خاص نمونہ باقی نہیں رہا۔ چونے یا لکڑی پر قدیم زمانے میں جو نقش و نگار بنائے گئے ہوں گے، ان کا اب کوئی نشان نہیں ملتا اور اس لئے اس کے متعلق ہم کچھ بیان نہیں کر سکتے۔ لیکن اس میں کوئی کلام نہیں کہ یہ فن اور اس کے بہت سے نمونے موجود ہوں گے جن سے آئندہ سنگ تراشی کے کام میں مدد ملی؛ وہ کاریگر جنھوں نے پلوی راجاؤں کے مندروں کا نقشہ بنایا اور مامل پورم کی چٹانوں پر سنگ تراشی کا کمال دکھایا، کسی طرح نو آموز نہ تھے۔ بلکہ درحقیقت دوسری قسم کے مسالے پر ایسے کام عرصہ دراز سے وہاں ہوتے رہے تھے اور نسل بانسل کا تجربہ انہیں میراث میں پہنچا تھا جس کے زور پر انہوں نے بوقت ضرورت پتھر پر اپنی کاریگری کے جوہر دکھائے؛ یہ بھی ثابت ہے کہ عہد چولا کی صناعی کا سلسلہ پلویوں کے زمانے سے جا ملتا ہے اور دونوں کے

بیچ میں کوئی بڑا فصل نہیں - پس بعد کے جو نمونے ہمارے سامنے ہیں وہ تدریجی ترقی کا نتیجہ تھے ؛ عہد چولا کا سب سے پرانا مندر، جس کی حسن و خوبی پر اس زمانے کے مبصّروں نے تفصیل سے بحث کی ہے، دادپورم (ضلع ارکاٹ جنوبی) میں واقع ہے اور دسویں صدی عیسوی میں بنایا گیا تھا ؛ لیکن اس زمانے کی سب سے اچھی عمارتیں تنجور اور گنگے کنڈ چولا پورم کے مندر ہیں جن کے بلند اور خوش نما منارے ساری عمارت میں نمایاں نظر آتے ہیں - بعد میں اصل عمارتیں بہت حقیر بننے لگی تھیں اور ساری محنت احاطے کے بیرونی "گوپورم" (یا ڈیوڑھی) کی تیاری میں صرف کر دی جاتی تھی جیساکہ چدمبرم کے مندر میں کیا ہے ؛ اور گو اس تدبیر سے عمارت کی ظاہری رفعت و شان بڑھ جاتی ہے. لیکن پوری عمارت دیکھ کر کچھ دل خوش نہیں ہوتا × × × × "

(اوکس ہس ۲۱۳)



غلط نامہ

صحیح	غلط	سطر	صفحہ
سندرم	سندرام	حاشیۂ زیرین	۱
ہر جگہ اس لفظ کا دوسرا ورتبہ بلفظ "راج ترنگنی" بنالیا جائے۔	"راج ترنجنی"	آخری سطر	۲
مکانات کی	مکانات کا	عنوانِ حاشیہ	۳۰
مرتبہ انسان کو	مرتبہ اسے	۱۲	۴۲
مغرب کے ہمسایہ	مغرب ہمسایہ	حاشیۂ زیریں	۴۵
(یہ عنوان چند سطر نیچے ہونا چاہئے)	"اصول وعقائد"	عنوان حاشیہ	۴۶
آوف	آوف	حاشیۂ زیریں سطر ۲	۴۸
یا "سورج	یا سورج	۸	۵۸
ستی کی رسم	ستی کی راسم	حاشیہ سطر ۴	۶۲
تائید چاہنی	تائید چاہنا	۱۰	۶۳
گھرا	گھر	۱	۸۶
وجیانگر	بجے نگر	حاشیہ	"
غیر	"غر	۵	۱۱۶
شمال مغربی	شمالی مغربی	حاشیہ	۱۱۹
شہراب	شہرب	۱۳	۱۴۵
سنین	سین	۱	۲۱۹